مسلمان کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
مروت حسن عالم گیر ہے مردان غازی کا

جناب نظیر احمد صاحب سے میں ازحد شکر
گزار ہوں - بڑے دلی جذبات کے ساتھ یہ
کتاب زندگی نذر کرتا ہوں

[illegible]

۲۳ [illegible]
۱۱
۲۲

لرزتا ہے میرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر

غالبؒ

شررِ خود آگہی

کر کسی سینۂ پُرسوز میں خلوت کی تلاش

علامہ اقبالؒ

مُصنّف

پرتھوی ناتھ بٹ

ریٹائرڈ کے۔ اے۔ ایس

جبہ کدل۔ شالہ یار سرینگر کشمیر

نذرِ عقیدت

میرے والد بزرگوار حکیم پنڈت ماسہج بٹ مرحوم

کے نام

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
ان ہی کی خاک میں پوشیدہ ہے یہ چنگاری (اقبالؔ)

"شررِ خود آگہی" کشمیر کے ایک بزرگ سوچنے والے جناب پرتھوی ناتھ بٹ کی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ مصنف نے اس سچائی کو بخوبی سمجھا ہے کہ "انسان دوستی" ایک ہمہ گیر جذبہ بھی ہے اور عظیم تر قدر بھی۔ روح کی غفلت اور خود آگہی پر ان کی گفتگو فکر انگیز ہے۔ تمام مذاہب جن سچائیوں کی طرف ذہن کو لے جاتے ہیں، مصنف نے اُن پر سنجیدگی سے غور کیا ہے۔ انسان کی غفلت اور اُس کی تخلیقی صلاحیتوں کا احساس عطا کرتے ہوئے پرتھوی ناتھ بٹ صاحب نے جو فلسفیانہ اسلوب اختیار کیا ہے اُس میں اُن کے جذبے اور فکر کی تازگی ہے۔ "شررِ خود آگہی" کے تجربے بہت قیمتی ہیں اور ان تجربوں کی حفاظت ضروری ہے۔

جناب پرتھوی ناتھ بٹ کا مطالعہ وسیع ہے، اخلاق کا ایک واضح تصور رکھتے ہیں، فرد اور فرد کے رشتے اور معاشرے کی عظیم تر قدروں کا انہیں شدید احساس ہے۔ اِس کتاب میں زندگی کی جن سچائیوں کو پیش کیا گیا ہے ان کا ادراک ایک بار پھر حاصل ہو جائے تو انسان کا معاشرہ تباہی سے محفوظ رہے گا۔

مجھے یقین ہے کہ "شررِ خود آگہی" کو ہر حلقے میں پسند کیا جائے گا۔ ہر دور میں کچھ حضرات ایسے ہوتے ہیں جو راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو باہر نکالتے ہیں، مایوسی کی

فضا میں ایک روشنی بن کر آتے ہیں۔ جناب پرتھوی ناتھ بٹ جو روشنی لیکر آئے ہیں
اِس سے ہر فرد، زندگی کی سچائیوں کا ایک جائیزہ لے سکتا ہے اور اپنی شخصیت
کی ایک نئی تشکیل کر سکتا ہے۔ مصنف کے فلسفیانہ خیالات کی جتنی قدر کی
جائے کم ہے یہ وہ فلسفہ ہے جو انسان کے بہتر تجربوں کا نچوڑ ہے، اس کا گہرا با معانی
رشتہ انسان کے پورے سفر سے ہے یہ وہ فلسفہ ہے جس کا تعلق انسان کی سوچ اور
اس کی پاکیزہ فکر سے ہے، اس کے جذبہ اور احساس سے ہے لہٰذا اس میں وہی
پاکیزگی ہے جو عبادت میں ہوتی ہے اور وہی تازگی ہے جو انسان کی سوچ اور فکر
میں ہوتی ہے۔

"شررِ خود آگہی" میں زندگی کو جس طرح سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی
گئی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ روحانی اقدار کا جس طرح احساس عطا کیا گیا ہے
اس سے جناب پرتھوی ناتھ بٹ کی پرخلوص شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔

مصنف کے بعض خیالات سے اختلاف کے باوجود، روحانی پاکیزگی
اور طہارت اور زندگی کی بہتر سچائیوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر
بن جاتا ہے۔ جس کتاب میں "عشق الٰہی" اور انسان اور انسان کے روحانی
رشتے پر گفتگو ہو اسے ایک بار تو سینے سے لگانا فرض بن جاتا ہے۔ مجھے
یقین ہے کہ یہ کتاب نئی نسل کے طلبہ و طالبات کے لئے خصوصاً ایک نعمت
ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن
صدر شعبۂ اردو
(کشمیر یونیورسٹی)

شعبۂ اردو
کشمیر یونیورسٹی 13/11/75ء

التماس

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ ہوش و ہستی کو
کہ سطحِ ذہنِ انسان سخت ناہموار ہے ساقی

یہ چھوٹی سی کتاب کوئی ناول یا ڈرامہ یا افسانہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی پُر اسرار جاسوسی کہانی جس کو ایک بار ہاتھ میں لینے سے ایک عام مطالعہ کرنے والا احساسات و جذبات کی گرفت میں آکر ایسی کتابوں کو بلا کسی تامل کے پڑھکر جلد ختم کرنا چاہتا ہے اور یہی دکھائی دیتا ہے کہ پڑھنے والا گویا ریل گاڑی میں سفر کرتا ہے اور اُسی رفتار سے اُسکی مطالعہ کرتا ہے۔ بلکہ درمیان راہ جو دائیں بائیں چیزیں ریل گاڑی کی تیز رفتاری کی وجہ سے بھاگتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، اُن کا وہ کوئی تاثر نہیں لے سکتا ہے۔ ماسوائے ایک دُھندلا سا تصور کے جو بعد میں اسکے ذہن سے جلدی ہی گُم ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں زندگی کے حقیقی مقصد کا اہم مسئلہ زیرِ غور لایا گیا ہے۔ اسلئے اگر یہی رفتارِ مطالعہ اس کتاب کیلئے بھی اختیار کیا جائے۔ تو مضمون کتاب ہذا کے لئے ناانصافی برتنی ہوگی۔ مناسب ہے کہ اس کتاب کیلئے رفتارِ مطالعہ ایک عام اطمینان سے پیدل چلنے والے کی اختیار کیا جائے تاکہ مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں جو اتفاق یا تضاد کے خیالات مضمون کے بارے میں آئینگے اور جن کا اُبھرنا حقیقی مقصد کتاب ہذا ہے۔ ایک دیرپا تاثر پیدا کرینگے جو موجودہ دور کی غفلت شعاری کو ترک کرنے کیلئے ہر ذی شعور انسان کے ذہن میں قائم ہونا نہایت ضروری ہے۔

اُن قارئین کرام سے جو اس مضمون کیلئے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن سے توقع ہے کہ وہ اس تخلیق کے بارے میں اصلاح و توضیح کا مشورہ دے کر ممنون فرمادیں۔

"مصنف"

عنوانِ موضوعات

پیشِ لفظ

عام آدمیوں سے خاص کر ان صفحات کے پڑھنے والوں سے اگر یہ سوال کیا جائے۔
کہ زندگی کا کوئی مقصد و منشاء بھی ہے یا نہیں۔ تو اُن میں سے کئی ایک اس سوال کا جواب
تلاش کرنے کی غرض سے اپنے اپنے ذہنی معیار کے مطابق اُن چیزوں کی طرف خیال کرینگے
جو اُن کے ذہن میں خواہشات کی صورت میں ہونگے یا اگر خواہشات پر مبنی نہیں ہونگے
تو اپنے مذہبی عقاید اور شرعی احکامات کو اپنے ذہن میں لاکر کچھ تامل کے بعد ہی وہ اس سوال
کا جواب دینگے جو کہ اُن کی جانب آخری نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک انہوں نے اِس سوال کا
جواب تلاش کرنے کے لیئے اپنی روز مرہ زندگی کے افعال و نتایج پر تجزیہ سے غور نہیں کیا
ہوگا۔ اکثر آدمیوں کے دل میں اِس قسم کا سوال خود بخود اُبھرتا ہوگا اور وہ مختلف پہلوؤں
سے اس پر غور ضرور کرتے ہونگے۔ شاید ہر ذی فہم سِن شعور تک پہنچنے پر کسی نہ کسی وقت یہ
سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اُس کی تخلیق کا کوئی سبب ضرور ہونا چاہیئے۔ لیکن صرف انسان ہی کے
ذہن میں یہ سوال کیوں پیدا ہوتا ہے چونکہ انسان میں خود آگہی شعوری طور ذہن میں ہونا ایک
قدرتی امر ہے۔ جبکہ دیگر حیوانات اس حقیقتِ خود آگہی سے محروم ہیں۔ ہر کام جو انسان کرتا ہے
غیر شعوری طور وہ خود آگہی سے ہی انجام دیتا ہے اور اس قدر مصروف عمل ہے۔ کہ وہ اصلی
مقصد و منشاءِ زندگی کو بھی بھول جاتا ہے۔ جس وجہ سے اُسکی زندگی دیگر جانداروں سے مختلف

تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے۔ لیکن انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے وہ صرف اسی وجہ کہ اسکی سرشت میں خود آگہی ہے۔ اور اس خود آگہی کو وہ شعوری طور حاصل کرنے سے حقیقی مقصد زندگی کو حاصل کر سکتا ہے۔

مادی ترقی کے حصول میں اور اسکی تگ و دو میں انسان اعلے نظر و فکر اور اخلاقیات کے عظیم اصولوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے حالانکہ یہ نظریات بنی نوع انسان کو پستی میں گرنے سے بچانے میں مددگار و معاون ہیں۔ اور صدیوں سے انسان کی حیوانی خواہشات اور غلط نظریات سے بچنے میں اسکی راہ نمائی کرتے ہیں۔ مادی ترقی دور میں انسان کم درجہ کی خواہشات کو پورا کرنے میں اس دیوانگی سے منہمک ہے کہ اسکے اعلے خیالات میں کوتاہی آجاتی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ انسان نیک اور عظیم شخصیتوں کے اُن ارشادات و احکام کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور سفلی صفات و خیالات و اعمال کو اُن پر ترجیح دیتا ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انسانیت کے اعلے خیالات، و حقیقی نصب العین زندگی کا تصور انسان کے نظر و فکر سے بہت دُور ہو جاتے ہیں۔

جن قوموں نے دور گذشتہ یا حال میں "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کو اپنا نصب العین تسلیم کیا ہے اور لذات عارضی کے حصول کے در پے رہے ہیں وہ انسان کو اطمینان قلب نہیں دے سکتے ہیں۔ دور حاضرہ میں اہل مغرب نے تو اس بارے میں کمال کر دکھایا ہے جنکی تقلید میں ایک طوفان بدتمیزی اور اخلاقی گراوٹ سے عام انسان کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اخلاق مذموم اور جرائم آئے دن بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ بلکہ اسوقت اُن قدروں کو ختم کیا جا رہا ہے جن کے لئے نیک اور برگزیدہ ہستیوں نے صدیوں اور قرنوں سے انسان کے ذہن میں اتارنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ جس سے ہمارے علم و ادب کا خزانہ بھرے

پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس دورِ حال میں ایک ایسا ادب معرضِ وجود میں آیا ہے اور فلسفۂ حیات کو نئے نئے روپ میں پیش کرنے کی مسلسل سعی کی جارہی ہے جس کا لابدی، یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ انسانی ذہن بجائے ارتقاء کے پستی کی طرف جھکتا جا رہا ہے۔ اس سے ہمارے حقیقی علم و ادب کے خزانوں کو ایک قصۂ پارینہ اور خیالات فرسودہ سمجھ کر آئندہ نسلوں کے لئے ایک ردی کے ڈھیر کی شکل میں پیش کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھائی جائیگی۔ مادی ترقی حاصل کرنے کے لئے جس بحران سے اسوقت عام انسان گذرتا ہے اسکے اثرات سے جو زندگی کی تشکیل ہو گی اور جو طرزِ تمدن و طرزِ فکر اس سے برآمد ہونگے گویا آنے والی پود کے لئے وہی نصب العین زندگی ہے۔

یہ ایک یقینی امر ہے کہ عام انسانوں کی راحت و آسائش کے وسائل میں ترقی ہوتی جائیگی اور سہولتیں از قسم خوراک۔ رسل رسائل۔ تفریح۔ سامان عیش و طرب وغیرہ تقاضائے وقت کے مطابق بڑھ جانی لازمی ہیں اور اسکی رفتار۔ ترقی کو کوئی آدمی روک نہیں سکتا ہے اگر عام لوگوں کی اقتصادی حالت بہتر نہ ہو گی تو نہ معلوم موجودہ رفتار بڑھتی ہوئی آبادی سے ان کے آنیوالی زندگی پر کیا تباہ کن اثرات پیدا ہونگے۔ اسلئے اس بڑھتی ہوئی مادی ترقی سے کیا نتایج اور اثرات ہو سکتے ہیں۔ ان کو زیرِ غور لانا لازمی ہے۔ اس کے لئے اہلِ مغرب کی مادی ترقی کی تاریخ سے تجربہ اور عبرت حاصل کرنا ضروری ہے اور وہ یہی ہے۔ کہ انسان کے نظر و فکر میں کافی حد تک گراوٹ آئی ہے اور عام لوگوں کو حواسِ خمسہ کی شعبدہ بازی اور دل فریبی میں انسان اپنے اصل مقصد و منشاء زندگی حاصل کرنے سے غافل رہ جاتا ہے۔ عام طور پر یہی پایا جاتا ہے۔ کہ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ نیک قدروں اور اصولوں کو ترک کرنا پڑتا ہے جو برے اعمال و اخلاقی گراوٹ کا باعث ہو کر بنی نوعِ انسان

کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارا ملک جو ہزاروں سال تک ساری دُنیا کو انسانی شرافت و عظمت کا درس دیتا رہا ہے اور وہ روشن تہذیبی ورثہ جو آج مغربی بے راہ روی کے باعث معرض خطرہ میں ہے اسبارے میں کوشش ضروری ہے۔ کہ جن قدروں اور اصولوں کی بدولت ہمارے ملک کی تہذیب جو صدیوں سے قائم ہے۔ اُن کو کوئی آنچ نہ پہنچے۔ عام لوگوں کے اقتصادی معیار کو بلند کرنے کے ساتھ ساتھ نیک اصولوں اور پاکیزہ قدروں پر آنچ نہیں آنے دی جائے۔ کیونکہ جس طریقۂ کار سے اِنسان اسوقت اقتصادی ترقی حاصل کرنے کی کوشش میں ہے۔ اِس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اقتصادی ترقی حاصل کرنے کے لئے ایک ایسا طوفان بدتمیزی برپا ہوا ہے جس میں بلا امتیاز نیکی و بدی سب جکڑے ہوئے ہیں۔

اس سیلاب کے بہاؤ کو کم نہیں کیا جاسکتا اور نہ کوئی انسان دور حاضر کی قدروں اور تقاضوں سے چھٹکارا پاسکتا ہے۔ لیکن اس طوفان میں رہ کر انسان کے ذہن کو ایک نیا موڑ دینا اور اسکی موجودہ ذہن کی رفتار میں ایک ٹھہراؤ ایک سوچ پیدا کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ اسبارے میں کوشش کرتی ہے۔ کہ ہمارے تعلیمی نصاب میں ایسے مضامین شامل کئے جانے ہیں جن کے مطالعہ سے انسان کے ذہن میں ناقابل تردید حقیقتوں اور اصلیتوں کی طرف دھیان منتقل ہوجائے۔ چونکہ اسکا ذہن دیگر اشیاء فانی کے حصول میں مرکوز ہوچکا ہے۔ جس کو وہ اپنی زندگی کا نصب العین تسلیم کرنے لگا ہے۔ اسلئے اِنسان کو ابتدائے سن شعور سے ہی اس مسئلہ کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔ کہ حقیقی مقصد زندگی کیا ہے اور کن ذرائع سے حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ حقیقی مقصد زندگی جو انسان کو روزمرہ زندگی کے فعل و عمل سے ذہن نشین ہوجائے۔ جس وقت ایک آدمی کا ذہن ایسے اہم مسئلے کے ادراک کی

طرف لگایا جائے۔ تو اُس کا ذہنی رجحان ایک مخصوص حالت اختیار کرتا ہے جس سے انسان کے
اعلےٰ خیالات کے ساتھ اسکے کردار و اوصافِ حمیدہ کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ اِس سے
اسکے ذہن میں تازگی آئیگی جو زندگی کی حقیقتوں کی تلاش کے بغیر ابدی شکل میں ملنا
محال ہے۔

الغرض حقیقی مقصد زندگی کی تحقیق و تجسس کا ایک عام آدمی کو بھی حقدار جائز بناتا
ہے۔ جو صرف چند روشن خیال افراد ہی نے اپنا حق سمجھ رکھا ہے۔ اس بڑے سے بڑے مسئلہ کو
سمجھنے کے لئے ایک معمولی ذہنیت کا آدمی بھی اس طرف رجوع ہو کر اپنے طرزِ فکر و عمل میں
ایک نئی روح کو ساتھ رکھیگا جس سے فی الواقعی اسکے افعال و اعمال کے معیار میں ایک اعلےٰ
حیثیت آئیگی اور ہمارے معاشرتی نظام میں بہت حد تک ایک اُمید افزا ماحول پیدا
ہوگا۔ اس بارے میں مختلف مذاہب میں جو مشترکہ حقیقتیں ہیں۔ ان کو ایک ہمہ گیر دماغی
سطح پر لایا جاتا ہے۔ وہ حقیقتیں جو اُن کے جُداگانہ اختیار کردہ شرعی احکامات۔
رہن سہن اور اعتقادات پر کوئی اثر نہ ڈالے۔ بلکہ ایسے اُصول عام انسان کیلئے قابل
قبول ہوں۔ نہ کہ اِس وجہ سے کہ وہ ایک مخصوص مذہب سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس وجہ سے
کہ وہ جملہ انسانیت کا ایک جز و منسلک ہے۔

اِس ہمہ گیر دماغی سطح پر انسان کے ذہن کو کھینچ لانے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے
اور وہ یہ ہے کہ اِسکو اشرف المخلوقات ہونے کا سبق یاد دلایا جائے اور اس کے لئے
ضروری ہے کہ جس صفت سے اِسکو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے وہ "خود آگہی" ہے
جس کو انسان کے شعور میں بیدار کرنا ہے۔ چونکہ یہی ایک واحد لطیف ترین حقیقت ہے
جس سے تمام کائنات مجبور ہے اور جو موجودات کی تمام شعبدہ بازی کی بنیاد ابدی ہے

جس وقت ایک عام انسان بھی خود آگہی کی قدر و منزلت اور ہمہ گیر صفت حاصل کریگا تو قدرتی طور اس بڑی سے بڑی چیز خود آگہی کی تحقیق و تجسس میں انسان کی ذہنیت ایک وسیع ترین پس منظر پر قایم ہوگی اور غیر شعوری طور انسان کے حرکات و سکنات میں وسیع طرز فکر و وسیع اظہار عمل و فعل پیدا ہوگا۔ جو موجودہ کوتاہی تخیل پر سبقت لے کر انسان کو انسانیت کا حقیقی مقصد حاصل کرنے کے لئے یقینی ذریعہ ثابت ہوگا اور وہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ دنیا میں اس کا وجود کس لئے عمل میں لایا گیا ہے۔

خود آگہی کیا ہے اور مذکورہ بالا سوال کا جواب کہ حقیقی مقصد و منشاء زندگی کیا ہے اس کتاب میں دیگر حقیقتوں کو پیش کرنے کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جو نہ کسی دقیق فلسفہ مذہبی سے بلکہ ایک عام انسان کی معمولی ذہنیت سے اس گتھی کو سلجھانے کی سعی ہے۔ یہ کوشش ایک چنگاری ہے جو اُس شخص کو مناسب گرمی نہیں دے سکتی ہے جس کا دل حقیقت تلاش کرنے میں سرد ہو چکا ہے اور نہ ہی کسی اندھیرے ماحول کو روشن کر سکتی ہے۔ یہ صرف ایک نشان ہے جس سے احساسات کی سرد مہری اور ماحول کے اندھیرے کی شدت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے البتہ ایک پُرسوز تلاش حقیقت کے لئے اور اُن انشا پردازوں کے لئے جنکو بنی نوع انسان کے وجدانی اور روحانی عنصر پر نظر رکھکر اپنے طرز بیان میں جاذبیت حاصل ہوئی ہے ایک آتش تلاش حقیقت سُلگانے میں ممد ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے پر کیا تاثر ہوگا۔ بقول علامہ اقبال اُمید ہے۔ کہ ؎

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات

"مُصنف"

مقصدِ زندگی

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ ہماری مقدس کتابوں میں اس بات کو مسلمہ قرار دیا گیا ہے۔ کہ انسان ہی موجودات میں ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ چونکہ انسان کو احساس علم ذات ہے جو دیگر حیوانات میں نہیں ہے۔ اس احساس خودی سے انسان نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے اور مشکلات میں وہ اسی کا سہارا لے کر ان کے حل کا ذریعہ تلاش کرتا ہے

کوئی شخص رنج و غم یا محتاجی کی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا ہے۔ بلکہ ہر شخص جس میں خود آگہی کا شعور ہے شادمانی کی زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہے۔ زندگی بنا رنج و غم و کمی کے ہی خوشی اور سکون کی زندگی ہے اور ایسی زندگی گذارنے کی تلاش قدرتی طور انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اس سکون و مسرت کو حاصل کرنے کے لئے انسان کیا کیا نہیں کرتا ہے۔

اس خوشی کو پانے کے لئے انسان جملہ موجودات سے خوشی کا لطف حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو حواس خمسہ سے اسکو مل سکتی ہے۔ یعنی وہ اپنے احساسات قوی باصرہ۔ شامہ سامعہ و ذائقہ و لامسہ کے ذریعے بہتر سے بہترین لمحات کو خوشی سے محظوظ بنانا چاہتا ہے اسلئے مختلف دل کشیوں کی کشش مثلاً لباس، رنگ و بو، نزاکت گل، نزاکت حسن، انسان، دیوتا وغیرہ دل میں جگہ کر لیتے ہیں اور انکی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ تواریخ اس بات کی آئینہ دار ہے۔ کہ کس طرح ایک انسان نے جب سے دنیا میں قدم رکھا ہے ایسی

اشیاء جوکہ حواس خمسہ کے ذریعے اس کے دل کو پسند آئی ہیں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ داستان عشق و محبت ۔مصوری ۔موسیقی دیگر ہم چو قسم فنونِ لطیفہ اس خوشی کو حاصل کرنے کے واسطے انسان مدارج اعلےٰ پر پہنچا ہے ۔جسکی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انسان ان چیزوں کے اظہار و عمل سے خوشی حاصل کرتا ہے ۔ وہ خوشی جو انسان حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کرتا ہے ابدی نہیں ہے بلکہ تبدیلی کی زد میں ہے اور ہمیشہ اسی خوشی کو حاصل کرنے کی خواہش بڑھتی ہی رہتی ہے۔

انسان دولت جمع کرتا ہے ۔اقتدار اور رُتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے ۔اسلئے کہ وہ اِن چیزوں کے حاصل ہونا ہی سکون قلب اور مسرت سمجھتا ہے ۔لیکن جب وہ ایسی خواہشات پوری کرتا ہے پھر بھی اسکے ذہن میں اُس خواہش کا معیار پورا نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ اِن ہی چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے ۔اگر ایک مفلس کو کسی طریقے سے ایک ہزار روپیہ مل جائے ۔خوشی تو وہ حاصل کریگا ۔لیکن وہ اس سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے ۔چونکہ اسکو ایک ہزار روپیہ ملنے کی خوشی سے اطمینان کلی حاصل نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اگر وہ لاکھوں روپیہ کا مالک بھی بن جائے پھر بھی اسکو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی تڑپ جاری رہتی ہے ۔ ایک ادنےٰ ملازم ایک افسر بن جانے کی خواہش رکھتا ہے ۔جب وہ افسر بن جاتا ہے تو ایک بڑا افسر یا حاکم اعلےٰ بن جانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے ۔ وہ کسی ایک عہدے پر پہنچ کر خوشی تو وہ حاصل کرتا ہے لیکن پھر بھی زیادہ حاصل کرنے کی ہوس سدا اسکے دل میں رہتی ہے ۔ الغرض اگر انسان کی وہ تمام خواہشات پوری ہو سکتی ہیں جن سے وہ خوشی حاصل کرتا ہے پھر بھی اسکو کمی کا احساس رہیگا۔ مکمل خوشی اسکو حاصل نہیں ہے! وہ مزید خوشی حاصل کرنے کے درپے رہتا ہے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

انسان جب اپنے نصب العین کے مطابق خوشی کو حاصل کر لیتا ہے پھر بھی اس سے آگے جانے اور مزید خوشی حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔ یہ کیوں۔ اسلئے کہ انسان کے ذہن میں غیر شعوری طور ابدی خوشی حاصل کرنے کی خواہش موجود ہے جس خواہش کے پورا ہونے کے لئے تمام وہ خوشیاں نامکتفی ہیں جو وہ مادی اشیاء کے حصول سے حاصل کرتا ہے۔ چونکہ مادہ تغیرات کی زد میں ہے اور وہ خوشیاں چونکہ محض مادی چیزوں کے حاصل ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ابدی چیزوں سے نہیں۔ اسلئے انسان کو مکمل خوشی حاصل نہیں ہوتی ہے اور اسکے دل میں مزید خوشی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس سے عیاں ہے کہ اگر انسان کو تمام دنیا کی دولت و ثروت حکومت و دیگر اشیائے سرور بخش مہیا کئے جائیں پھر بھی اسکو اطمینان قلب اور مکمل سکون نہیں ملتا ہے بلکہ اسکے ذہن میں مزید خوشی حاصل کرنے خواہش بدستور رہتی ہے چونکہ وہ اپنی تمام قوت مادی اشیاء کے حصول کے لئے استعمال میں نہیں لا سکتا ہے جو قوت حصول اسکی روح میں موجود ہے۔ اس وجہ سے انسان کا مادی اشیاء کے حاصل کرنے میں قانع نہ ہونا ایک قانون قدرت ہے۔ یہی ایک خواہش۔ ابدی خوشی کے حصول کی انسان میں ہے جو کسی اور ذی روح حیوان میں نہیں ہے۔ اگر انسان میں یہ تلاش خوشی نہ ہو تو بے جان پتھر ہے۔ ابدی خوشی حاصل کرنے کی صفت ہی سے انسان کو ایک انسان ہونے کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔ سب خواہشات حاصل ہو کر بھی انسان کو سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہے۔ پھر بھی طلب ہے۔ جب تک انسان کو لا انتہا دولت

ثروت و اقتدار ہر خوشی مُیسر ہو وہ مزید حاصل کرنے کے لئے برابر کوشاں رہیگا سے

ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانہ جنوں نشو و نما کا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان یہ سب چیزیں بے انتہا دولت و ثروت وغیرہ ہر خوشی حاصل کر سکتا ہے جبکہ اُسکی روح میں ایک ابدی طاقت موجود ہے ؟ تو اسکا جواب نفی میں ہے۔ چونکہ جن چیزوں سے وہ ابدی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے دراصل وہ سب فانی ہیں اور تغیرات کی زد میں ہیں اس لئے دیرپا نہیں ہیں۔ اُن سے وہ خوشی حاصل نہیں ہو سکتی ہے جس کے حاصل کرنے کے بعد مکمل سکون و اطمینان اسکو حاصل ہو اور انسان مزید خوشی حاصل کرنے کی کوشش ترک کرے۔ اسلئے فانی چیزوں کے حاصل کرنے کے بعد وہ ابدی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

انسان خواہشات کے طوفان کا مجسمہ ہے۔ کبھی وہ فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر جاکر ہی دم لیتا ہے۔ کبھی سیارگان پر کود پڑنے میں جان کی بازی لگاتا ہے۔ کبھی ہوا اور خلاء میں اُڑتا پھرتا ہے۔ کبھی زمین کو چیر کر اسکی تہہ میں پہنچتا ہے اور کبھی سمندروں کی تہہ میں ڈوب کر ہی دُرِ مقصود حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے پھر بھی اس خواہش کے طوفان سے خلاصی نہیں پاتا ہے۔ ایک چھوٹے سے پانی کے جھرنے کی طرح مجسمہ بے تابی وجدت ہے۔ جب تک نہ وہ پانی بحر بے پایاں میں جاکر سکون و اطمینان حاصل کرے تب تک وہ نیرنگ بے تابی خواہشات ہے۔ انسان ہر تجربہ کے بعد ایک گونہ خوشی تو حاصل کرتا ہے لیکن وہ عارضی ہے۔ اس وجہ سے جو وہ خوشی حاصل کرتا ہے آخری نہیں چونکہ اسکو اطمینان کُلی نصیب نہیں ہے بقول

"ہر قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں راہ عشق میں
سمجھے ہر اک سنگ کو سنگ در جانانہ ہم"

کے مصداق ہر خوشی حاصل کرنے کے بعد اسکو معلوم ہوتا ہے کہ جو خوشی حاصل ہوئی ہے آخری نہیں ہے مزید حاصل کرنے کے لئے حیران و پریشان اور مبتلائے جد و جہد رہتا ہے جب تک نہ اسکو اطمینان کلی حاصل ہو۔ اور وہ تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب وہ آخری ابدی خوشی اسکو حاصل ہو جائے یہی حقیقی مقصد زندگی ہے۔

دنیا جس کو ہم دیکھتے ہیں ہماری نظروں میں ہر طرف محدود نظر آرہی ہے۔ عنصر خاک ہی تقریباً ایک تہائی سے کم ہماری زمین کا ہے جو ہمارا بسیرا ہے۔ جس جگہ ہم ٹھہرے ہوئے ہیں اور بہ تناسب دیگر عناصر بہت تھوڑی چیز ہے اس کی مقدار بھی محدود ہے۔ اس محدود چیز سے ایسی لامحدود چیز کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری روح میں لامحدود خوشی حاصل کرنے کی جو خواہش اور قوت موجود ہے محدود چیزوں سے ہم لامحدود خوشی حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ جس طرح دیگر ذی روح حیوانات محدود چیزوں سے محدود خوشی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن انسان میں اگرچہ غیر شعوری طور ہی سہی ابدی خوشی حاصل کرنے کی خواہش موجود ہے۔ اور جو خوشی انسان مادی چیزوں کے حصول سے حاصل کرتا ہے دراصل اِس لامحدود خوشی کا ایک احقر ترین درجہ ہے، آخری نہیں ہے انسان میں مادی چیزوں سے خوشی حاصل کرنے کی جو تڑپ موجود ہے۔ یہ وہی تڑپ ہے جو انسان کی روح میں ابدی خوشی حاصل کرنے کی ہے۔ لیکن انسان کا ذہن اس تڑپ کا نشانہ صرف حواس و عناصر خمسہ ہی کو بنا دیتا ہے۔ اور اِس میں مبتلا رہتا ہے تو ابدی خوشی کی تلاش شعوری طور ذہن میں لانے سے رہ جاتا ہے۔

اِس اَبدی خوشی کی تلاش میں بنی نوع انسان کی ممتاز ترین شخصیتیں پیغمبران
اولیاں اور برگزیدہ حضرات رشی و منی جیسے انسان پیدا ہوئے ہیں۔ جو مشعل راہ بن کر ابدی
خوشی حاصل کرنے کی تلقین کے لئے معرض وجود میں آئے ہیں۔ ایسی عظیم شخصیتوں کو بھی
خواہش رہی ہے۔ کہ جملہ انسانیت، اُن کے کلام اور کردار سے مسحور ہو کر مادی اشیاء کے حصول
کی خواہش سے کنارہ کش ہوں اور جو تڑپ اُن کی روح میں ابدی خوشی حاصل کرنے کی رہی ہے
اُس کے حاصل کرنے کے لئے بھی انسان درپے رہے۔ اس اَبدی خوشی حاصل کرنے کے
لئے اُنھوں نے مختلف ذرائع بتائے ہیں۔ یہ ذرائع مذاہب عالم کے نمونہ سے انسان کو ترقی
پر لے جانے کے لئے بتلائے گئے ہیں۔ اِس ابدی خوشی پر لے جانے کے ذریعے کا نام مذہب۔
دھرم یا فرض دیا ہے۔ یعنی یہ ایک محرک ہے جو کہ ایک ذی روح انسان کو کام کا سلیقہ
اور ابدی خوشی حاصل کرنے کے لئے ایک مجبوری عاید کرتا ہے۔ اُن برگزیدہ شخصیتوں کو
بھی خواہش حصول ابدی خوشی رہی ہے۔ جسکی تلقین انھوں نے بنی نوع انسان کو محنت
شاقہ سے کی ہے۔ وہ ایسی خوشی کے حاصل کرنے کے لئے ایک اعلےٰ مقام پر پہنچ گئے
تھے۔ کیا انکو وہ مکمل خوشی نصیب ہوئی جس کے وہ متلاشی تھے؟ اُن کی روح میں خواہش
بدستور رہی۔ چونکہ تصورات میں مادی اشیاء کے تاثرات ملسلک رہے جن کے زیر اثر
وہ پیدا ہوئے۔

ایک عظیم شاعر جب وجد میں آکر گرمئی نشاط تصور سے نغمہ سنج ہوتا ہے۔
وہ نہایت دلفریب پُرلحن و پُرمعنی انداز میں شعر کہتا ہے۔ وہ اسی پر اکتفا کرتا ہے۔
لیکن وہ اس سے زیادہ بڑھ چڑھ کر شعر کہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ لیکن پھر بھی نصب
العین شاعری باحساسِ خود حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ اگر اُس نے کیا ہوتا تو اُس کی

مزید کچھ کہنے کی تڑپ نہ رہتی۔ اس طرح ایک مصور ایک آخری تصویر بنا نہیں سکتا ہے جو مکمل ہو اور وہ مزید تصویر بنانا چھوڑ دے۔ اسکے متعلق کہا گیا ہے۔

" نیشود دور ز نقاش چو شد نقش تمام
ہر قدر کار تو نہ پذیرد و خوب است "

مگر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ کہ ہر ایک نظام سیاسی۔ اجتماعی۔ اقتصادی ٹیکنیکی مدارج ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہے اگر ہوتی تو مزید کہنے اور کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اس سے ثابت ہے کہ انسان جو حواس خمسہ سے بہتر سے بہترین خوشی حاصل کرتا ہے ابدی نہیں ہے۔

اس ابدی خوشی کے حاصل کرنے کے لئے انسان کے ساتھ ایک پیدائشی صفت وابستہ ہے جو کہ قدرت سے اسکو عطا ہوئی ہے۔ چونکہ قدرت ایک لا انتہا ابدی خوشی کا اظہار ہے۔ آگ کی صفت جلنا ہے۔ اسکے ساتھ اچھائی یا برائی کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ ایک اختصاصی حقیقت ہے۔ اسی طرح انسان کے ساتھ مذہب۔ دھرم۔ فرض ایک قدرتی صفت موجود ہے چاہئیے وہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور وہ قدرتی صفت خوشی حاصل کرنا ہے۔ خوشی حاصل کرنے کا جذبہ انسان شکم مادر سے ہی لیتا ہے۔ بچہ دودھ پیتا ہے تو اُسے مسرت و شادمانی حاصل ہوتی ہے۔ یہ احساس خوشی بہ لحاظ رنگ و نسل و مذہب و ملت نہیں ہوتا ہے۔ اس کے لئے کوئی جغرافیائی حد بندی نہیں ہے۔ تمام مذاہب میں نوزائیدہ بچے کے لئے ایک خوشگوار ماحول پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ اکتساب خوشی کے لئے زندگی کے اعلیٰ مدارج طے کرے اور اس ابدی خوشی کے حصول کے لئے غیر شعوری طور پر اسکے ذہن کو تیار کیا جاتا ہے تاکہ یہ احساس ہو کہ اسکا وجود اعلیٰ

مقاصد کے لئے اور اعلےٰ فرائض کی انجام دہی کے لئے ہوا ہے اور وہ فرض ہے ۔ ابدی خوشی
کی تلاش۔ کم از کم ہر ایک مذہبی روایات میں انسان کے پیدا ہونے کے ساتھ ایسے رسم و رواج
لاگو ہو چکے ہیں۔ جن کے تحت انسان کے لئے اسلئے مدارج ترقی ابدی خوشی حاصل کرنے کا
ماحول بنایا جاتا ہے ۔ جو اسکے وجود کو لاشعوری طور اس بات کی تلقین کرتا ہے ۔ کہ اسکو
زندہ رہ کر ایک لا انتہا خوشی حاصل کرنی ہے ۔ اگرچہ اس لا انتہا خوشی کو مختلف نام
دئے گئے ہیں جن میں خدا ۔ اللہ ۔ بھگوان ۔ پرمیشور ۔ پرم آتما شامل ہیں۔ اور انسان کی
ساری زندگی بھی ختم ہو جائے وہ ان ناموں کی وضاحت نہیں کر سکتا ہے ۔ چونکہ جوں جوں
وہ میدان عمل زندگی میں مصروف و مشغول حصول خوشی میں رہتا ہے ۔ ان ناموں کے ساتھ
ایک تنہائی بڑھنے لگتی ہے چونکہ یہ نام اسکی سمجھ میں لائے جانے کی کوئی کوشش نہیں کی
جاتی ہے ۔ اگر کوشش بھی کی جاتی ہے تو انسان کاروبار جہاں سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے
یا اپنے آپ میں ایک تساہل پیدا کرتا ہے اور بحیثیت انسان جس میدان عمل میں اسکو
بہ ہوش و حواس مصروف عمل رہنا ہے اُس سے گریز کرنا پڑتا ہے ان ناموں کے ساتھ لفظ
خوشی کا نام دیا گیا ہوتا تو انسان کے ہر وقت ہر لحظہ احساس میں ٹھوس طریقہ سے موجود رہتا۔
اور وہ سمجھ سکتا کہ وہ ہر کام اس خوشی کے لئے ہی کرتا ہے نہ کہ خدا اور بھگوان کے لئے ۔
جن کو وہ اس خوشی کے حاصل کرنے کے وقت پس پشت ڈال دیتا ہے اور صرف بغرض امداد
ہی اسکی جانب رجوع ہوتا ہے ۔ ورنہ یہ مختلف نام انسان کے ذہن میں ایک وہم کی صورت
موجود رہتے ہیں۔ الغرض جن رسم و رواج مخصوص مذہبی روایات کے زیر اثر انسان زندہ رہتا
ہے ۔ اُن سے یہی اخذ ہوتا ہے کہ انسان ابدی خوشی حاصل کرنے کی تلاش میں لگا رہے اور
انسان کے لئے یہی سب سے بڑا فریضہ ہے ۔ گویا انسان نے جسوقت سے دنیا میں قدم رکھا ہے

اُس پر قدرتی فرض عاید ہوا ہے یا اسکو اسی ایک فرض کے پورا کرنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔

اور وہ فرض ہے کہ اِنسان اَبدی خوشی حاصل کرے۔ ظاہری طور اگر غور سے دیکھا جائے کہ اس خوشی کا پہلو کہاں سے نکالا گیا ہے۔ تو وجہ پیدائیش ہر ذی روح حیوانات کیا انسان صرف چند لمحات مادی خوشی سے ہی ہے۔ اس وجہ سے انجام بھی وجہ خوشی ہونا چاہئیے جو کہ عام طور دیکھا گیا ہے کہ نہیں ہے۔ چونکہ انسان تلاش ابدی خوشی سے دُور رہ کر رنج و غم وکمی کی زندگی کا تجربہ کرتا ہے۔ جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرض اِنسانی کی انجام دہی میں کوتاہی کرتا ہے۔

فرض

دھرم۔ ڈیوٹی۔ فرض یہی ہے کہ انسان کو جس کام کے لیے مُنتخب کیا گیا ہو وہ بخوبی انجام دے۔ کسی مخصوص کام کو لگن اور شوق کے ساتھ پورا کرنے کو فرض بتلایا جاتا ہے۔ کائینات کا ذرہ ذرہ اپنے فرض کے انجام دینے میں منہمک نظر آتا ہے۔ پس یہ فرض فطرت کے ہم معنی بھی ہو سکتا ہے یہاں پر اس امر کی وضاحت لازمی ہے۔ کہ فرض کا اصل مقصد کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دنیا میں ایک نظام قائم ہے جس کے تحت ہر ایک چیز اپنے اپنے مخصوص وقت پر اپنے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو ایک گڑبڑی ہو جاتی اور طوفان بدتمیزی پیدا ہو جاتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح ایک نظام کے تحت سورج کا طلوع و غروب ہے۔ گردش سیارگان اور اوقات تبدیلی موسم و نباتات کے پیدا ہونے اور ختم ہونے میں ایک نظام کام کر رہا ہے۔ اگر یہ نظام

نہ ہوتا تو ایک انتشار رہوتا جہاں وجہ اور اثر میں کوئی مستقل رشتہ قایم نہیں ہوتا۔ اس نظام کو جو ایک قاعدہ کے تحت تمام کائینات میں رواں دواں ہے اور اشیائے خورد و کلاں کے وجود و بقا کا انحصار اسی نظام پر قایم ہے فطرت کا ہم معنی ہے۔ اس کائینات میں ہر ایک ذرہ دوسرے ذرات کے ساتھ اس نظام کو قایم رکھنے میں مجبور ہے اور ملا ہوا ہے۔ اسکا یہ مطلب ہے کہ کسی ذرے کی حرکت انفرادی نہیں ہو سکتی ہے۔ جبتک کہ اس عالمی نظام میں باقاعدگی کی تحریک موجود ہے۔ اسلئے اگر ہر ایک ذرے کو اس جملہ نظام کے قاعدے کے خلاف حرکت دی جائے تو تضاد پیدا ہوگا۔ جسوجہ سے باقاعدگی میں خلل واقع ہوگا اور اسکے نتیجہ کے طور پر سارا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اور تمام ہستی ختم ہو سکتی ہے اسوجہ سے کہ کائینات موجود ہے اور نابود نہیں ہے۔ اسلئے اس کائینات کی زندگی کے لئے ایک موافق نظام کی ضرورت ہے اسی وجہ سے یہ نظام قایم ہے اور قدرت کا فرض ہے۔ یہ فرض صدیوں سے برابر پورا کیا جا رہا ہے۔ اس میں دونوں حیات اور ممات یعنی مثبت و منفی قوتیں باقاعدگی کے ساتھ کام کرتی آئی ہیں اور کرتی رہینگی یعنی پیدائش و فنا ایک قاعدہ کلی کے تحت معرض وجود میں آئے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ کائینات میں ایک ابدی طاقت زندہ رہنے کی موجود ہے۔ چونکہ جسقدر تضاد یا نقص اس نظام میں کسی وقت بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اسکی درستی ساتھ کے ساتھ ہوتا رہتی ہے۔ جو تکمیل فرض کا ایک لابدی نتیجہ ہے۔

دھرم اور فرض کے اگر لغوی معنی کی طرف خیال کیا جائے۔ تو ان سے مطلب ہے کہ حکم جو ٹھہرا ہوا ہے جس میں حکم خدا کی بنیاد ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو نظام کائینات ابھی نہ ہوتا۔ یہ نظام اسی دھرم اور فرض کی بدولت ٹھہرا ہوا ہے اور یہی ایک شیرازہ ہے اس تمام کائینات کا۔ اگر یہ شیرازہ بکھر جائے تو کائینات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نیست و نابود ہو جائیگی اور

ظہور قدرت کا کرشمہ جو اسوقت چل رہا ہے نہیں ہوتا۔ اُدھرم وہ چیز ہے جو کہ اس نظام کے خلاف ہے۔ اگر اس نظام کے بدلے ایک کُلی بد انتظامی ٹھونس دی جاتی تو کائینات نیست و نابود ہو کر کالعدم ہوتی۔ اس سے یہ چیز ثابت ہے کہ یہ ساری کائینات ایک نظام کے تحت وجود میں آئی ہے اور اسکی مثال اوپر دی گئی ہے کہ یہ کرۂ ارض گردش میں ہے اور ایک معیار کے تحت اپنے محور پر قایم ہے جس کی وجہ سے دن رات برابر صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور یہ فرض پورا ہوتا چلا آیا ہے۔ اگر یہ فرض پورا نہ ہوتا تو ہماری زندگی بھی نہ ہوتی اور نظام میں کوئی تسلسل نہ رہتا۔ گو یا جو مخلوقات ہمارے ذہن میں اسوقت موجود ہے اس فرض کے پورا ہونے کی وجہ سے زندہ ہے اور یہی دھرم ہے۔ یہی نیکی ہے جس سے یہ کائینات موجود ہے غایب، یا نابود نہیں ہے۔ اس نظام کی حقیقت دراصل ہر ایک شے میں موجود ہے اور یہ وجود ایک فطری تقاضا ہے۔ یہ نظام کسی زارِ روس نے اِنسان پر ٹھونس نہیں دیا ہے گو یا جو نیکی اسوقت موجود ہے کسی انسان کے حکم سے ہم پر لاگو نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ نیکی اس کائینات کے ہر ذرے میں موجود ہے جس سے یہ سارا نظام ایک دھرم سے ایک فرض کے تحت چل رہا ہے۔ جسوقت یہ دھرم اور فرض اس کائینات کا ختم ہوگا۔ اُسوقت ساری کائینات ختم ہو جائیگی۔ اِسلئے یہ بات واضح ہے کہ اخلاق حسنہ یعنی نیکی وغیرہ کسی قانون دان نے ہم پر لاگو نہیں کئے ہیں اور نہ ہی کسی انسان نے یہ چیز ہماری زندگی کے ساتھ نظام کائیناتی کے ساتھ آئی ہے۔ اسی چیز کو وقت وقت پر ہمارے اوتاران اور پیغمبران اور عظیم ہستیوں نے دُھرایا ہے۔ اُنہوں نے بنی نوع انسان کو کوئی نئی چیز نہیں دی ہے بلکہ جس نظام پر یہ کائینات ٹھہری ہوئی ہے وہی دھرم ہے وہی فرض ہے وہی ڈیوٹی ہے اور وہی مذہب ہے۔ جن کو نیکی وغیرہ اخلاق حسنہ کی نقلبند کے لئے معرض وجود میں لایا گیا ہے

یہ دھرم اور فرض انفرادی نوعیت کا نہیں بلکہ مجموعی طور تاثر پیدا کرنے کے لئے ہے چونکہ یہی ایک چیز ہے جس کی حقیقت کُل سے وابستہ ہے اور کُل میں جتنی اشیاء ہیں۔ سب اسی ایک دھرم سے وابستہ ہیں۔ اگر ایک انفرادی شے کو کسی دوسری شے کے ساتھ کوئی تعلق یا رشتہ نہ ہوتا تو وہ چیز وجود میں نہ آتی۔ اسلئے ہر ایک شے کا آپس میں ایک رشتہ قایم ہے۔ یہ اصول یا قانون جس سے ایک مضبوط اور مربوط شیرازہ و رشتہ تمام موجودات عالم میں باہمدیگر قایم ہے۔ یہی دھرم ہے اور اس نظام مکمل میں جس انسان کو اس حقیقت کا علم ہے۔ کہ یہ ایک نظام کائینات ہے جس کے ماتحت ہر ایک شے اس نظام میں علیحدہ انفرادی طور قایم نہیں ہے بلکہ ہر ایک شے سے ایک خاص رشتہ سے تعلق رکھتا ہے اور ایک انسان کس طرح کُل کائینات کے دیگر ذرات کے ساتھ جُڑا ہوا ہے اور ایک بنیادی رشتہ سے منسلک ہے وہی شخص نیک ہے۔ اُس شخص کے کردار بھی نیک ہونگے۔ جس شخص کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ دیگر اشیائے دُنیا سے علیحدہ نہیں ہے بلکہ تمام دیگر انسانوں کے ساتھ خاص کر اور دیگر موجودات کائینات کے ساتھ عموماً ایک بُنیادی مربوط رشتہ سے قایم ہے۔ اسکے برعکس ایک بدکردار شخص وہ ہے جو اپنی محدودیت کا احساس ہے۔ کہ تمام دنیا میں وہ صرف تن واحد ہے اور محض خودغرض ہونے کا قایل ہے اور کہ دوسرے شخص کے ساتھ کوئی رشتہ یک جہتی نہیں ہے اور خاص کر ہم جنسوں میں خودغرضی کا حامل ہے وہی شخص بد ہے۔ اگر ہر انسان کو یہ احساس ہوگا کہ وہ صرف اپنے ذاتی اغراض کے لئے زندہ ہے اور کسی دوسرے شخص کے ساتھ اسکا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تو دنیا میں ایک بے ترتیب مجموعہ انسانوں کا قایم ہوتا اور نہ ہی کوئی مذہب اُس صورت میں قایم ہوتا جس کا تصور اس وقت ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے تمام مذاہب میں مذہب کی بُنیاد ہی اخلاق حسنہ پر رکھی گئی ہے جس سے ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ایک نزدیکی رشتہ قایم رکھا

جاسکتا ہے۔ اگرچہ مختلف مذاہب کے طریقہ کار علیحدہ علیحدہ اور مختلف ہیں۔ لیکن اس بات
پر جملہ مذاہب متفق ہیں۔ کہ اخلاق بد وجہ پریشانی و کمزوری ہیں اور اخلاق حسنہ وجہ
راحت و ہم آہنگی ہیں اور جسقدر انسان میں نیکی کا عمل ہوگا اُسی قدر وہ باعث راحت
اور کُلی نظام کی باقاعدگی کو قایم رکھنے والا ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنہری زمانہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ جس کو رام راج
سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس راج میں غربت بھی تھی اور تمام قسم کے دکھ درد بھی جو ایک
انسان کو اس دار المحن میں ہیں۔ اُس زمانہ کے لوگوں میں بھی تھے۔ لیکن اس حد تک نہیں
جس حد تک وہ گذشتہ کئی برسوں سے چلے آرہے ہیں۔ اُس زمانہ کے لوگوں میں ایک خاص
پابندی تھی اور وہ پابندی اخلاق حسنہ کو حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ایک مجبوری
عاید کرتی تھی جس میں علم خود آگہی بھی شامل تھا۔ لوگ اس علم کی جانب زیادہ متوجہ تھے۔
حواس خمسہ سے جو خوشی اور رنج اُنکو حاصل تھے دوسرے درجہ پر تھے وہ اُن میں گرفتار
نہ تھے۔ رنج و غم و احساس کمی ہو کر بھی اُن میں نیکی تھی۔ یہی نیکی انسان کا فرض اولین
اور دھرم ہے۔ چونکہ نیکی سے انسان اپنے آپ کو محدود تسلیم نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اپنے لئے
ایک وسعت اختیار کرتا ہے جہاں پر اسکی خود غرضی زائل ہوتی ہے۔ چونکہ بدی وہ چیز ہے
جو اس کو محدودیت کے دائرہ میں بند کرتی ہے اور نیکی اسکو کائنات کے ساتھ ہم آہنگی
دیتا ہے۔ محدودیت مفروضہ چیز ہے اصلی نہیں۔ چونکہ اصلیت محیط کُل ہے جس کا ہر ذرہ
مرکز ہے۔ گویا مرکز اور محیط میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ایک حقیقی رشتہ سے قایم ہیں
اور دونوں لازم و ملزوم ہیں جو جُدا نہیں ہو سکتے ہیں۔ کون ذرہ مرکز ہے اور کون ذرہ
محیط ہے لفظ کُل میں اسکا امتیاز نہیں ہے۔ جہاں روحانیت کا غلبہ ہے وہ کمالِ اثباتیت ہے

جہاں مادیات کا غلبہ ہے وہاں خفا فرق ہے۔ اسلئے رام راج میں غلبہ روحانیت کی وجہ سے ہی اس زمانہ کو سُنہری زمانہ کہا گیا ہے۔ اور اس زمانہ کے لوگوں میں ایک قوت تھی اُس قوت سے بڑھ کر جو کہ راون نے تمام حواس خمسہ کے قوتوں پر قادر ہو کر حاصل کی تھی۔ جس سے ثابت ہے۔ کہ حواس خمسہ کی طاقتوں پر ہی جو قادر ہے وہ قادر مطلق نہیں ہے بلکہ وہ ہے جس کو ایک بڑی چیز جو حواس خمسہ کی قوتوں سے بڑی ہے وہ علم خود آگاہی ہے۔ جس سے بڑھکر ذہن انسانی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسکی نہ پیدائش ہے اور نہ ہی موت ہے اور اس چیز کے ہونے پر راون جیسے طاقتور انسان کو بھی پس پا ہونا پڑا۔ اس علم خود آگاہی کی بنیاد یہی دھرم۔ ڈیوٹی۔ فرض ہے جسکا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ یہ تمام واقعات و تواریخ جن سے نتایج حقیقی پیدا ہوئے ہیں۔ ایک مکمل نظام کے ہونے کی وجہ سے ظہور میں آئے ہیں۔ چونکہ اس نظام میں اگر باقاعدگی نہ ہوتی تو نیک و بد کی صورتیں ہو کر بھی کچھ نتایج پیدا نہ ہو سکتے۔

اس نظام کی باقاعدگی کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کیوں ایک باقاعدہ نظام اِس کائینات میں مشاہدہ کرنے سے پاتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال سے واضح ہو سکتا ہے۔ اگر برقی رو کی دو تاریں باقاعدگی کے ساتھ استعمال میں نہ لائی جائیں اور اُن کے ایک باقاعدہ نظام میں خلل ڈالا جائے تو برقی رو بے کار ہو گی اور جو لمپ روشنی کے لئے رکھا گیا ہے روشنی نہیں دیگا۔ اور ہمارے کام میں رکاوٹ پیدا ہو گی اور مشکل ہو گی کہ جو خوشی ہمیں بجلی کے لمپ کے جلنے سے ہوتی وہ ختم ہو گی۔ اسی طرح اس موجودات عالم میں نیک و بد دونوں صورتوں میں ایک باقاعدگی موجود ہونے سے ایک بہت بڑی خوشی کا راز ہے۔ سارے نظام کا ماحصل ایک خوشی ہے اور یہ خوشی برابر قایم رہیگی جب تک اس نظام میں جس کے نتیجہ طور پر خوشی ظاہر ہوتی ہے کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ انسان نیک و بد میں

تمیز کرکے نیکی اور خلوص کے طریقہ کار کو اپنائے۔ یہی ایک فرض اولین انسان کا ہے۔ جس کو دھرم، مذہب، فرض سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جو صرف ایک لاانتہا خوشی حاصل کرنے کے لئے انسان کی روح میں موجود ہے نہ کہ انسان کے عناصر و حواس خمسہ کے کرشمہ جات میں ہے۔

لفظ نظام کے ساتھ کوئی صفت اچھائی یا بُرائی وابستہ کرنا اسکے اصلی معنی کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ نظام ایک قاعدہ ہے جس کے تحت اجزا و ذرات کی حرکت جاری ہے نیک و بد کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض حرکت، چاہیئے وہ حرکت بری ہے یا اچھی۔ اسکے ساتھ کسی صفت کا لاحق کرنا حقیقت سے دُور رہنا ہے۔ اس نظام میں ایک فقیر کامل ہے اور دوسرا قصائی۔ اُن کے افعال کسی نظام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ یہ اُس نظام کی رفتار ہے کہ کس جگہ کس طرح افعال سرزد ہونے لازمی ہیں۔ ایک جگہ ایک مشین کا پرزہ دائیں طرف چلتا ہے تو دوسرا بائیں طرف اور دیگر پُرزے مختلف سمتوں میں۔ مشین صرف ایک نظام کے تحت کام کرتی ہے۔ یہ دائیں بائیں اوپر نیچے پُرزوں کا چلنا اس مشین کے اصل حصول مقصد کے لئے ہی ہے۔ اس لئے کسی کا چیز کا ہونا ہی اس چیز کی ضرورت اس نظام کے باقاعدہ چلنے کے لئے ہے۔ دنیا میں شاذ ہی کوئی ایسا ملک یا قوم ہے جس کی زندگی میں کوئی ایسے ناخوشگوار واقعات نہ گذرے ہوں جو انسانیت کے چہرے پر ایک بدنما داغ ثابت نہ ہوئے ہوں۔ ایسے واقعات کی اُس ملک یا قوم کے اجتماعی حیاتِ نظام کے لئے ضرورت رہی ہے۔ اگر یہ واقعات رونما نہ ہوتے تو وجہ اور اثر کا سلسلہ قایم نہ رہتا جو کہ موجودات کی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ گویا اس سارے نظام کے قائم رہنے کے لئے ہی کچھ ایسے نتایج ظہور میں آتے ہیں جو انسان کے ذہن کے معیار کے مطابق اچھے یا بُرے ہیں اور جن کی بنیاد وجہ اور اثر پر قایم ہے۔ اگر یہ سلسلہ نہ رہتا تو نہ تو نظام میں باقاعدگی رہتی اور نہ ہی درستی نظام ہو سکتی جو کہ نظام اور اسکے موجودات

کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔

اس نظام کے ساتھ علم ذات وابستہ ہے۔ جو کہ فطرت انسان میں موجود ہے۔ دھرم۔ فرض ہی اسکے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس سے انسان اس ذاتِ واحد جس کو مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ حاصل کر سکتا ہے۔ گویا جو خواہش اسکے حاصل کرنے کے لئے ہے وہی فرض انسانی ہے۔ جو انسان اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتا ہے۔ اُس میں حیوانیت کا عنصر غالب ہے۔ انسان میں یہ دونوں چیزیں ہر وقت دوش بدوش رہتی ہیں۔ ایک حیوانیت اور دوسری روحانیت۔ موخر الذکر چیز کو ہی علم ذات "Consciousness" خود آگہی کہا جاتا ہے۔ جو کہ حیوانوں میں اُس حد و قوت تک نہیں ہے جس لامحدود حد و لامحدود قوت تک انسان میں ہے۔ جس مخلوق میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہے وہ صرف انسان ہے جس کے وجود میں ذات وحدہٗ لاشریک کا عکس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے وجود کی حقیقت کے جاننے کے لئے کوشش میں سرگرداں ہے۔ لیکن کبھی یہ طبعی کوشش خواہشات نفسانی میں تبدیل ہوتی ہے۔ چونکہ حواس خمسہ سے خوشی حاصل کرنے کی خواہش بدستور رہتی ہے جو کہ گوناگوں ہے اور تمام عمر اِنہی محسوسات کی خواہشات پوری کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ مقصد وہ خوشی حاصل کرنی ہے جو کہ حواس خمسہ سے بالاتر اور عقل و دانش سے بالاترین ہو اور جو صرف روح کو حاصل ہو جس کی جھلک انسان اپنے محسوسات میں تبدیل کرتا ہے۔ جس طرح ہیرے کے ذروں میں روشنی ایک ذرے سے دوسرے ذرہ میں جاتی ہے اور واپس اسی چکر میں ہے حالانکہ دیکھنے والوں کو ہیرا روشن دکھائی دیتا ہے۔ انسان اسی طرح اپنے حقیقی دھرم۔ صفت سے گر جاتا ہے اور حواس خمسہ کے کرشمہ سازی سے مسحور ہو کر اس چکر میں مقید ہو جاتا ہے۔ اسلئے جو شخص محسوسات حیوانیت سے منہ موڑ کر روحانیت کو زیادہ اپناتا ہے وہی اصلی انسان کہلائے

جانے کا مستحق ہے اسلئے کہا گیا ہے!

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا غالبؔ

چونکہ حیوانات سے وہ تمام افعال سرزد ہوتے ہیں جو انسان کرتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ انسان میں آگہی علم ذات ہے وہی روحانیت ہے یعنی خواہش حصول لاانتہا کا شوق ساتھ ساتھ ہے لیکن انسان کے وجود میں حیوانیت کا غلبہ ہے وہ روحانیت کی بجائے حواس خمسہ کی رنگینیوں میں مجذوب ہوتا ہے۔ یہ جنگ حیوانیت اور روحانیت کے مابین فطری طور ہر وقت ہر لمحہ ہرتی رہتی ہے۔ جو اس جنگ سے آزاد ہوگا روحانیت کی طرف زیادہ مائل ہوگا۔ اسلئے آرام اور زیادہ سے راحت کا پانے والا ہوتا ہے بلکہ لا انتہا مسرت و شادمانی حاصل کر سکتا ہے۔ اس سرچشمہ حیات ابدی اور لا انتہا خوشی کو خدا بھگوان اور منتہی الطلف کے نام دئے گئے ہیں اور اس کو حاصل کرنے کا کام فرض منصبی بنی نوع انسان ہے

مسئلہ

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ منتہی الطلف جس کو ہم احساسات ظاہری سے محسوس نہیں کرتے ہیں۔ موجود ہے یا یہ ایک وہم ہے۔ اگر وہم ہے تو اسکی طلب غیر ضروری ہے اور اس چیز کو جس کا وجود حقیقت پر مبنی نہ ہو حاصل کرنے میں پریشان رہنا نادانی ہے اور اسکی تلاش فضول ہے۔ قبل اسکے کہ اس مسئلے کے حل کی تلاش کی جائے۔ یہ زیر غور لانا ضروری ہے۔ کہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کس کو ضرورت ہے اور کیوں ہے۔ اس

مسئلے کے حل کرنے کی تلاش اُس شخص کو ہوگی جو لا انتہا خوشی حاصل کرنے کا خواہاں ہوگا چونکہ اُس شخص کے تمام حرکات و سکنات اس ایک مقصد کے حاصل کرنے کے لئے وقف ہو چکے ہیں اور وہ ہے لا انتہا خوشی حاصل کرنا۔ چونکہ اسکی روح میں ازل سے ہی یہ تڑپ موجود ہے جسکو وہ اپنی روزمرہ زندگی میں شعوری طور پر ذہن میں نہیں لا سکتا ہے۔ یہ ایک صفت ہے جو ہر انسان کی سرشت میں موجود ہے۔ ایک انسان میں وہ ساری باتیں موجود ہیں۔ جو اور انسانوں میں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ طریقہ مختلف ہے۔ مختلف امور کا اظہار مختلف ذرائع سے ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک مجموعہ ہے انسانیت کا جس میں ہر انسان بلالحاظ مذہب و ملت و رنگت محض ایک مخصوص شئے انسان ہونے کے ناطہ سے ایک ہی دائرہ میں قائم ہوا ہے۔ اس مخصوص دائرہ انسانیت میں جہاں کہیں ایک ذرے سے کوئی حرکت یا خیال کا اظہار ہوتا ہے تو اسکا اثر تمام دائرے میں ہونا لازمی ہے۔ بلکہ دوسرے معنوں میں کوئی خیال یا حرکت بدون اُس کلی نظام کے پیدا نہیں ہوتا ہے جس سے یہ دائرہ انسانیت قائم ہوا ہے۔ اور جو خیالات اس میں پیدا ہوتے ہیں ہر ایک انفرادی ذرہ اس کے نتیجہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ اگرچہ ظاہری طور انسان کو اسکا علم نہیں ہے۔ انسان ہونے کی صفت سے ایک رشتہ جملہ انسانیت میں قائم ہے جو اٹوٹ ہے۔ جس نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے وہ مکمل ہے۔ اس میں گھٹنے اور بڑھنے کا سوال نہیں ہے۔ البتہ تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں کوئی واقعہ بدون اُس کلی قاعدہ کے نہیں ہے۔

دنیا میں مختلف آب و ہوا میں رہنے والے۔ مختلف آبائی بنیاد والے مختلف زبان و رہن سہن کے طریقے رکھنے والے اگرچہ بحیثیت انسانی عقل کے ان میں اختلاف ظاہری ہے

لیکن جس وقت کوئی برگزیدہ انسان کسی مقام پر اس دایئرہ انسانیت میں پیدا ہوتا ہے۔ اسکے
خیالات سلم و عقل سے۔ جو باتیں رونما ہوتیں ہیں وہ دوسرے انسان بھی جو اُن سے مختلف
حالات و ماحول میں پیدا ہوئے ہیں۔ متاثر ہوتے ہیں۔ تمثیلاً ہندوستان کے باشندگان
کے تخیلات جسکا اظہار برگزیدہ شخصیتوں نے کیا ہے۔ دیگر ممالک کے باشندگان بھی پسند
کرتے ہیں۔ جہاں مذہب، نسل۔ آب وہوا۔ طرز تمدن مختلف ہیں۔ اس سے عیاں ہے کہ انسان
جملہ انسانیت کا ایک جزو ہے اور جملہ انسانوں کی فطرت یکساں ہے۔ اگر ایک انسان کسی خاص
چیز کا موجد ہے۔ تو اسکی ایجاد جملہ انسانیت کا ورثہ ہے اور جملہ انسانیت اس سے اثر پذیر ہے۔
قطرہ سمندر کا ایک جزو ہے اور اس میں وہ تمام صفات بدرجہ اتم موجود ہیں جو کُل یعنی سمندر میں
پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک فرد بنی نوع انسان کا جزو ہے اور فطری خصایئص میں سب
انسان مشترک ہیں۔

یہاں پر اس بات کی توجہ دلائی جانی ضروری ہے کہ عام لوگ کیوں عظیم شخصیتوں کے
خیالات اور حقیقتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ جن حقیقتوں اور خیالات کا اظہار برگزیدہ شخصیں کرتی
ہیں۔ اُن کا عام لوگوں میں پہلے ہی موجود ہونا لازمی ہے۔ چونکہ وہ تمام حقیقتیں اور خیالات لاشعوری
طور انسان کی سرشت میں موجود ہیں۔ بلا امتیاز اسکے کہ کوئی انسان حقیر ہے یا عظیم ہونے کی
تعریف میں آتا ہے۔ اگر یہ حقیقتیں اور خیالات عام لوگوں کے ذہن میں لاشعوری طور پہلے سے ہی موجود
نہ ہوتے تو اُن تمام برگزیدہ شخصیتوں کے کلام اور خیالات عام لوگوں کے لئے صدا بصحرا ہوتے۔
اور کوئی شخص اِنکو تسلیم نہیں کرتا۔ دراصل وہی عظیم شخصیتوں کے مالک ہیں۔ جو
انسان کے اُن خیالات اور حقیقتوں کو موثر اظہار بیان سے منصۂ شہود پر لانے میں کامیاب
ہوا۔ ور اُن احساسات کی جو انسان میں لاشعوری طور موجود ہیں ترجمانی کرنے میں ہا۔ حقیقت

ہوں۔ وہ کوئی نئی چیز عام لوگوں کو نہیں دیتے ہیں۔ یہ سب حقیقتیں اور خیالات انسان میں پہلے ہی موجود ہیں۔ چونکہ اُن عظیم شخصیتوں اور عام انسان میں بنیادی طور دائرۂ انسانیت میں کوئی کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ وہ عظیم شخصیت کا مالک ہے جو انسان کے اُن خیالات و مقاصد کو انسان کے ذہن میں بیدار کرنے اور اُن کی ترجمانی کرنے میں کامیاب ہو اور خوشی اور لاانتہا خوشی حاصل کرنے میں رہبری کر کے امداد دے سکے۔

جس وقت انسان کا دائرہ ذہن وسیع سے وسیع تر ہو جائے اور جو چیزیں ہمیں حواس خمسہ کے ذریعہ محسوس ہوتی ہیں جن میں جمادات و نباتات اور ہر ذی روح یعنی جس میں کائنات کا ہر ذرہ شامل ہے تو ہر ذرہ ایک محیط و بسیط ہستی کا راز لئے معلوم ہوگا۔ اسلئے اگر ایک ذرے کی حقیقت معلوم ہو جائے اور اُس کی ہستی کا راز ہاتھ آجائے تو یہ تمام راز افشا ہو کر انسان کے لئے وہ لاانتہا خوشی حاصل کرنے کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ جو کہ اسوقت تک سائنس سے حل نہیں ہو سکا ہے حالانکہ فلسفیوں نے مادہ سے آگے تخیل پردازی سے اس تلاش کو کہیں آگے لے چکے ہیں لیکن راستہ کی طوالت کا اندازہ نہیں لگایا ہے کہ اسکی منزل کہاں ہے۔ انہوں نے اس منزل کا پتہ لگایا ہے۔ کہ لاانتہا خوشی ہے جو حیاتِ ابدی کا سرچشمہ ہے۔ اسوجہ سے انسان کے شعور میں ایک خود آگہی کا احساس ہے۔ بلکہ لاشعوری طور اسکے حاصل کرنے میں زندگی کے ہر فعل و عمل سے کوشاں ہے۔ یہی زندگی کا راز ہے۔ ایک انسان کی نہیں بلکہ جملہ انسانیت کے یعنی بنی نوع انسان کی۔

ایک بڑے چیز کی غرض و غایت ہم بتا نہیں سکتے ہیں۔ کیوں کہ ایک بڑی سے بڑی چیز سے ہم بہت چھوٹے ہیں۔ اسلئے چھوٹی چیز کو ذہن میں لے کر ایک بڑی چیز کی نسبت دریافت کر سکتے ہیں۔ دنیا ایک بڑی چیز ہے اور جسم انسان اس کے مقابل ایک بہت چھوٹی چیز ہے

اگر اس دنیا کو اپنے بدن کی مثال لے کر ذہن میں لائینگے تو دنیا ایک بدن ہونے کے تصور میں آسکتا ہے۔ اور جملہ مختلف پیدائیش اس میں مختلف اعضاء واجزء جس میں ہر قسم کے مرکبات موجود ہیں جس طرح انسان کے بدن میں اسکی مثال موجود ہے۔ اس بدن میں جہاں کوئی بیماری لگ جاتی ہے۔ تو اسکا مطلب ہے کہ نظام صحت میں درستی کی ضرورت ہے۔ دراصل بیماری ایک ضرورت ہے۔ ایک قابل غور اشارہ ہے۔ کہ بدن کے نظام میں کوئی خلل واقع ہوا ہے کسی عضو یا جزو کے نظام میں فرق آیا ہے۔ اسی طرح جب بھی اس دنیا کے بدن میں کسی حصہ میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ تو اس حصہ میں درستی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے۔ کہ نظام کی باقاعدگی میں کوئی بے ضابطگی رونما نہ ہو۔ اسلئے مختلف مقامات پر مخصوص طریقہ علاج کی ضرورت کے لئے انسان پیدا ہوئے ہیں۔ جو انبیا و اولیا اور برگزیدہ شخصیتوں کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ جو اُس مقام کے نظام کی درستی کے لئے خاص کر اور دیگر مقامات کے لئے بطور مشعل راہبری لے کر آئے ہیں۔ چنانچہ عرب میں خرابی ہوئی۔ یونان چین۔ ایران اور ہندوستان و دیگر ممالک میں جہاں جہاں خرابی پیدا ہوئی۔ اپنے اپنے حالات اور مقام کی جوازیت کے مطابق ایسی جگہوں پر عظیم شخصیتوں کے مالک ظہور میں آئے اور انسانیت کی درستی کرنے کی غرض سے اپنے اپنے تاثرات سے تبدیلیاں لائے جس سے تمام بنی نوع انسان کے لئے بیماریوں کا علاج کر کے درستی کی۔ اگرچہ ظاہری طور اپنے اپنے جغرافیائی و آبائی حالات کے تحت ایسے طریقہ جات علاج مختلف رہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جملہ آبادی صحتیاب ہوئی۔ چونکہ جہاں ایک لمپ کی روشنی جو ایک لمحہ پہلے تھی دوسرے لمحہ وہی نہیں ہے یعنی تغیرات کی زد میں ہے اور جس چیز میں تغیرات ہیں وہ مکمل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں جن بیماریوں کا علاج پیدا ہوا۔ اُنکا مفاد دیگر جگہوں پر قبول نہیں ہوا۔ اور نہ ہی دنیا کے ہر حصہ میں اسکے استعمال کا موقعہ ملا ہے

اسلئے مختلف مقامات پر مختلف مُصلحین و معالج پیدا ہوئے۔ آجکل رسل و رسایل کی فراہمی کی وجہ سے دُور دُور علاقہ جات کا بھی علاج کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں کچھ اخلاقی بیماریوں کا علاج اب بآسانی یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں بھی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ایسے معالج وویکانند۔ رام ترتھ اور موجودہ دور میں مہایش یوگی اور دیگر اس معیار کی شخصیتیں اپنے اپنے ارشادات سے یورپ اور امریکہ میں اپنے اُس ابتدائی مقصد کو جو لا انتہا خوشی حاصل کرنے کا ہے رہبری کرتے رہے ہیں۔ ایسی برگزیدہ شخصیتوں کا ایک ہی مقصد رہا ہے کہ وہ انسانیت کے مرض " آرزو کی بے بیشی " کا علاج کریں اور وہ مرض ہے کہ انسان لا انتہا خوشی حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتا ہے۔ جس انسان کو یہ خواہش نہ ہو تو اسکے افعال و اعمال سے خرابی پیدا ہوگی۔ چونکہ جب انسان کے دل میں ایسی خواہش جاگزیں ہوگی تو قدرتی طور اسکے سوچ اور سمجھ میں لاشعوری طور ایک عظمت و بلند پروازی ذہن پیدا ہو گی۔ جو اسکو دیگر سفلی خواہشات نفسانی کے حاصل کرتے ہیں، اسکی روح کی طاقت کو بے جا صرف کرنے سے باز رہنے کی ضرورت کا احساس دیگی۔ اس ضمن میں اوپر دئے خیالات سے اس بات کا کافی اشارہ مل سکتا ہے کہ مذکورہ مسئلہ ہستیٔ الطف کے حل کی تلاش کس کو ضرورت ہے اور کیوں ہے۔

طریقہ تلاش

کسی مشین سے اگر کام لینا ہے تو انسان یہ کام عالم بیداری میں کر سکتا ہے نہ کہ عالم خواب یا عالم بے خبری میں۔ اگر عالم خواب یا عالم بے خبری میں حقیقت کا پتہ لیا جائے۔ تو اسکا مطلب ہے کہ ہم جسم انسانی کو اپنے صفت افعال سے بے بہرہ بناتے ہیں۔ تلاش صرف عالم بے داری کا

حقیقتوں سے ضروری ہے۔ بیداری کی حالت میں جو تاثرات بذریعہ مشاہدہ افعال حاصل ہوتے ہیں
ان کی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ جن کو عالم خواب یا عالم بے خبری کے تجربات کالعدم نہیں کر سکتے ہیں
تبلہ حواس خمسہ ہی وہ ذرائع ہیں جو عالم بیداری میں ہم کو حقیقت موجودہ سے آشنا کرتے ہیں۔ اگر
عالم بیداری میں ہمیں کسی چیز کی نسبت ایک دھوکہ ایک بے علمی لاحق ہوگی۔ تو اسکی اصلیت اور
حقیقت بھی عالم بیداری کی حقیقتوں سے ہی یہ دھوکہ اور بے علمی دور ہو سکتی ہے۔ چونکہ عالم
خواب اور عالم بے خبری کی بنیاد ہماری عالم بیداری کے تجربات اور حقیقتوں پر ہی قایم ہے
اعمال و افعال سے جو انسان پر عالم خواب یا عالم بے خبری طاری کرتے ہیں۔ جن میں یوگ سمادھی
حبس نفس یا ذکر کرنے سے ایک غیر معمولی احساسات انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ
دراصل انسان کے اُن قواء کو بے کار بناتے ہیں جو کہ انسان کو عالم بیداری میں حاصل
ہونے لازمی ہیں۔ جن سے انسان اپنے معمول کا کاروبار جہاں جن کی انجام دہی سے وہ انسان
ہے اور بہ ہوش و حواس قایم ہے۔ ان میں کسی قوت میں تعطل نہیں پیدا کرتا ہے۔ یہ سب
اس نظام میں خلل ڈالے جانے کے مترادف ہے جس نظام میں ایک باقاعدگی اور ایک صیحح
نسان کو قایم رکھنا ضروری ہے۔

زندگی عناصر میں ظہور ترتیب ہے۔ ترتیب وہ نظام کلی ہے جس کے تحت عناصر
پیدا ہوئے ہیں۔ اور تمام مخلوقات ارضی و سماوی کا موجد یہی نظام ہے۔ بلکہ ہر ذرہ
کائینات اس نظام کی بدولت زندہ ہے اسی نظام کے سہارے موجودات عالم کی زندگی
ہے۔ اس نظام کے لئے ایک مقام ہونا لازمی ہے۔ جس طرح جسم انسان کے لئے مزید ایک باقاعدہ
تنظیم کی ضرورت ہے جس سے یہ کام کرتا ہے یا زندہ ہے۔ جس چیز سے یہ ٹھہرا ہوا ہے۔ بنیادی
طور ضروری ہے۔ مشاہدہ سے یہ بات واضح ہے کہ ہر شئے موجودہ کے لئے اسکے اظہار کے لئے

ایک مقام نہایت ضروری اور بنیادی ہے۔ وہ مقام جب تک نہ مل جائے ہم اس نظام کی غرض وغایت جس کے لئے یہ قائم ہے۔ نہیں جان سکتے ہیں۔ اس کے جاننے کے لئے آنکھ۔ کان۔ ناک۔ سانس بند کرکے علم حاصل نہیں کرنا ہے۔ چونکہ ایسا کرنے سے ہم اس جسم کے تمام حواس کے کام میں خلل ڈالنے کے سزاوار ہوسکتے ہیں۔ اِسکا علم اپنے ہوش وحواس قائم رکھکر ہی حاصل کرنا ہے جس کے لئے ایک تجربہ گاہ کی ضرورت ہے۔ جس طرح ایک سائینس دان کو ضرورت ہے۔ وہ ایک ذرے کو لے کر ہی تمام ذرات کے راز حاصل کرسکتا ہے۔ سائینس دان کی تلاش اشیائے موجودات کے متعلق عام ترکیب اشیا کا علم حاصل کرنا ہے۔ لیکن فلسفہ اور روحانیت کی تلاش حصول علم لاثانی شے ہے۔ فلسفی کو کوئی چیز سائینس دان کی طرح جمع کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔ اسکی تجربہ گاہ۔ لیبارٹری اُس کا جسم زندہ ہے اور آلہ اِسکا ذہن اور خود آگاہی ہے۔ چونکہ اس میں تمام وقت و وسعت اور قوت ہر چیز حاصل ہے۔ لہذا وہ ذات ابدی جسکا ذکر اوپر آیا ہے۔ اسکا ہونا عقل کسی حیلہ وحجت کے تسلیم کرتی ہے یا نہ صرف اپنے جسم کے افعال واعمال و تاثرات کا مشاہدہ کرکے ہی اِسکا ہونا اس چھوٹی سی تجربہ گاہ جسم میں پہچانے جانے کی سعی ہوسکتی ہے۔ اور اسکے نتائج تجربہ وحصول غرض وغایت ہستی پر حاوی ہوسکتے ہیں اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوگی۔ یہ تصور کرنا فضول ہے۔ چونکہ لا انتہا خوشی کی اصلی حالت میں کل آگہی علم ذات میں انسان عالم بیداری میں بہ ہوش وحواس خمسہ زندہ ہوگا۔ عالم خواب یا عالم بے خبری میں نہیں۔

جملہ الفاظ کی بنیاد ایک نقطہ سے ہوئی ہے۔ اگر قلم کی حرکت اولین نقطہ سے شروع نہ ہوتی تو یہ تمام لکھنا نہ ہوتا۔ گویا جو علم وادب تحریر میں آیا ہے۔ اسکی ابتدا ایک نقطہ سے ہوئی ہے اور کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس میں یہ نقطہ ابتدا اور انتہا میں نہیں ہے۔

اِسلئے اُس ابتداء کے ساتھ انتہا بھی موجود ہے اور دونوں میں یکسانیت ہے۔ اگر ابتدا نہ ہوتی تو انتہا کا خیال بھی نہ آتا۔ اسلئے ابتدا اور انتہا میں ایک رشتہ ہے جو درمیان میں بصورت وقت و وسعت قائم ہے۔ اگر وقت اور جگہ کو ذہن سے خارج کیا جائے تو اول و آخر میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ ؎

سین انسان گر بیفتد از میان
اول و آخر بماند شیر آن

یکسانیت درمیان ہجوم موجودات کے اظہار سے ختم نہیں ہو سکتی ہے۔ چونکہ ابتدا اور انتہا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انسان نے اس نقطہ کا استعمال اور لکھنا کیوں کیا ہے۔ یہ کام ہے جو انسان نے اپنی خواہش کے پورا کرنے کے لئے کیا ہے۔ کیونکہ اُس نے ایسا کرنے سے ایک خوشی۔ ایک اطمنان حاصل کیا ہے۔ اس طرح انسان کے ہر ایک فعل سے جو وہ زندگی میں کرتا ہے محض اپنے آپ کے لئے ذاتی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جبقدر افعال و اعمال کرتا ہے۔ اُس میں ذاتی اطمینان حاصل کرنے کی غرض ہے۔ چنانچہ انسان جتنے اشیاء جس میں مکان۔ میز۔ سڑک وغیرہ چیزیں شامل ہیں بناتا ہے اُن کے محض ہونے سے اسکو ایک اطمینان اور خوشی حاصل کرتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ کسی چیز کا ہونا ہی اس بات کی دلالت ہے کہ اسکے ہونے سے ایک خوشی و اطمنان حاصل ہے۔ اسی طرح دیگر چیزیں۔ جو انسان نے بنائی نہیں ہیں لیکن موجود ہیں اور اُن کا موجود ہونا ہی ایک خوشی ہونے کی تصدیق ہے۔ گویا چیزوں کا وجود ہی ان میں خوشی کے پہلو کی دلالت کرتا ہے۔ اس دلیل سے یہ قرین قیاس ہے کہ جبقدر موجودات عالم ہیں۔ ان کے موجود ہونے میں ایک بہت بڑی خوشی کا راز موجود ہے چونکہ جبقدر چیزیں انسان نے بنائی ہیں اُن کا موجود ہونا ہی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ وہ ان

چیزوں کے بنانے اور اُن کو قایم رکھنے سے ایک خوشی حاصل کرتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں کئی ایسی چیزیں ہیں جو انسان نے بنائی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو انسان نے نہیں بنائی ہیں۔ اِن میں سے جو چیزیں انسان نے بنائی ہیں وہ اُن چیزوں سے بنائی گیں ہیں جو انسان نے نہیں بنائی ہیں اور جو انسان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی موجود تھیں۔ اور انسان کے پیدا ہونے کے بعد بھی بدستور قایم ہیں۔ یہ چیزیں انسان سے بہت بڑی چیزیں ہیں ان بڑی چیزوں کے ہر ایک پہلو کو ہم نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ چونکہ ہم ان چیزوں سے بہت چھوٹے ہیں۔ اگر ایک فٹ بال شکل کی ایک بڑی گول چیز پر چیونٹی رکھی جائے تو اُسکی نظر اس کے کل محیط پر نہیں پڑ سکتی ہے۔ اسی طرح ہم بھی مقابلتاً بہت بڑی چیز کا ... طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر ہم اپنے سے کسی چھوٹی چیز کو لے کر ہی اسکا مشاہدہ کرینگے تو بہت حد تک اس چھوٹی چیز کا مکمل اندازہ لگا سکتے ہیں جو جو بڑی چیز دیکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ دنیا میں جو سب سے چھوٹی چیز ہے، وہ ایک نقطہ ہے۔ جس میں کسی لمبائی و چوڑائی کا لحاظ نہیں ہے۔ بلکہ یوں بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کہ تمام کائینات ہی ایک مجموعۂ نقاط ہے اور اس تمام کائینات میں نقطہ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ چونکہ نقطہ کے بغیر دیگر اشیا جو معرض وجود میں آئی ہیں تصور میں نہیں آسکتی ہیں۔ ممکن ہے ہمارے معیار بڑائی سے اور بڑی چیزیں ہونگی جو ہماری قوت بصارت سے باہر ہو سکتی ہیں۔ لیکن جہاں تک سب سے چھوٹی چیز کا تصور ہماری قوت بصارت میں ہے وہ صرف ایک نقطہ ہے اور اِس نقطے کا تصور انسان نے اسکے اظہار کرنے کے وقت حاصل کیا ہے۔ اس نقطہ کے اظہار سے کسقدر علم و ادب وجود میں آیا ہے اِسکا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ نقطہ کے اظہار کے لئے اس نقطہ سے بڑی جگہ ہونی لازمی ہے۔ اگر اس نقطہ سے بڑھکر کوئی

جگہ نہ ہوتی تو نقطہ کا اظہار نہیں ہو سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ کسی چیز کے اظہار کے لئے اس چیز سے بڑھکر وسعت ہونی ضروری ہے۔ اور دنیا میں جو کچھ ہے اور جن ذرات سے یہ مرکب ہوا ہے وہ وسعت ہے جو کہ بہت بڑی چیز ہے۔ جس چیز پر ہمارا وجود قایم ہوا ہے وہ کرہ ارض ہے اور جو چیزیں اس کرۂ ارض پر ہیں وہ اس سے چھوٹی ہیں۔ اگر یہ بڑی چیز نہ ہوتی تو دیگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کا وجود بھی نہ ہوتا۔ چھوٹائی اور بڑائی ہمارے ذہن میں ایک قدرتی تاثر ہے جسکو ہم جھٹلا نہیں سکتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت سے دور مفروضہ توہمات سے اس حقیقت کو غلط ہونا تسلیم کیا گیا ہے جو کہ ٹھوس اصلیت سے اور بہ ہوش و حواس قائم کسی صورت میں تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے۔ اسلئے تلاش حقیقت کے لئے ٹھوس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔

خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات

اقبال

راستہ

کائینات میں جو موجودات ہیں ان کی بناوٹ میں بنیادی پانچ عناصر تسلیم کئے گئے ہیں۔ اور وہ ہیں خاک۔ آب۔ آتش۔ باد۔ خلا یا آکاش۔ ان عناصروں میں جو سب سے چھوٹا عنصر ہے وہ خاک ہے جو ہماری دنیا ہے۔ جس پر ہمارا بسیرا ہے اور جس پر ہماری پیدائیش ہوتی ہے۔ اگر یہ عنصر نہ ہوتا تو ہماری زندگی بھی نہ ہوتی۔ خاک کا عنصر پانی کے عنصر سے

چھوٹا ہے۔ اگر پانی کا عنصر جو خاک سے بڑا ہے نہیں ہوتا تو خاک کے عنصر کا وجود نہ ہوتا۔ یوں بھی اگر ہم دنیا کا نقشہ دیکھینگے تو اس میں پانی کم از کم دو تہائی ہے اور خاک اس سے کم تقریباً ایک تہائی ہے۔ چونکہ ہر چیز کے وجود کا انحصار اُس سے بڑی چیز کے وجود پر ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ خاک کی پیدائش اپنے سے بڑے عنصر پانی سے ہوتی ہے۔ یعنی پہلے پانی پیدا ہوا ہے اور اسی میں سے خاک کا عنصر پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح پانی کی پیدائش آگ سے ہوتی ہے اور آگ کی پیدائش ہوا سے اور ہوا کی خلاء یا آکاش سے۔ یہاں تک پانچ عناصر ایک دوسرے کی پیدائش کے سبب ہیں۔ ایک خلاء ہی ہمارے دنیا کا سرچشمہ حیات ہے۔ اگر خلاء نہ ہوتا تو ہماری زندگی بھی نہ ہوتی چونکہ ہماری زندگی کرۂ ارض پر پیدا ہوئی ہے جبکی پیدائش بالترتیب خلاء کے عنصر سے وجود میں آتی ہے۔ آکاش کے تصور سے یہ تمام کائنات وسعت میں پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

خاک سے خلاء تک جو موجودات بذریعہ حواس خمسہ دکھائی دیتے ہیں۔ اِن میں ایک جگہ کا ہونا تصور میں لازمی ہے۔ ایک وسعت ہمارے مشاہدہ اور ذہن میں قائم ہوئی ظاہر ہوتی ہے۔ اِس وسعت میں ہر ایک شئے کے درمیان ایک وقفہ یا فاصلہ ہونا بھی پایا جاتا ہے۔ چونکہ موجوداتِ عالم میں اپنی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ اگر یہ انفرادیت نہ ہوتی تو ہمارے ذہن میں اس وقفہ یا فاصلہ کا تصور مختلف اشیاء کے درمیان بھی نہ ہوتا بلکہ اس تفاوت جگہ و وقت سے جملہ اشیاء کا بن جانا اور تبدیل ہیئت کرنا بھی ہوتا ہے اس تمام کاروبار میں جب تک حرکت نہ ہوتی ایک چیز کا وجود دوسری چیزوں سے نہ ہو سکتا۔ یعنی اس نظام میں ایک حرکت ہی ہے جو تمام موجودات میں پائی جاتی ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ حرکت ہی تمام موجودات کے لئے باعث ہستی ہے۔ اگر موجودہ وسعت خلاء میں ہیئت اشیاء کی

موجودہ کو منفی کیا جائے تو ایک چیز صرف حرکت ہی رہ جاتی ہے۔ اسلئے تمام چیزیں حرکت سے وجود میں آئی ہیں اور یہی ایک حرکت ذرہ اور ذرات میں موجودہ سائنس نے ثابت کی ہے اس حرکت سے لکھنے والے نے خیالات رقم کئے ہیں۔ باقی موجودات اور لکھنے والے میں تفاوت جگہ اور وقت رہتی ہے۔ لیکن حرکت میں تفاوت نہیں رہتی ہے۔ یہی ایک باریک رشتہ ہے جو دیگر موجودات کے ساتھ انسان کو قریب کرتا ہے۔

خلاء سے آگے جب اس حرکت کی پیدائش کا سبب تلاش کرتے ہیں تو حواس خمسہ خلاء سے آگے نہیں جا سکتے ہیں اسلئے لازمی طور وہاں رک جانا پڑتا ہے۔ چونکہ یہ باریک رشتہ حرکت لکھنے والے کے ساتھ ہے۔ اسلئے ذہن لکھنے والے کی طرف آجاتا ہے۔ اب یہی دیکھنا ہے کہ لکھنے والے کی یہ حرکت کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ کسی عام چیز کا اگر ایک ذرہ بھی ہو تو اُس ذرے سے اُس عام چیز کی حقیقت پائی جاتی ہے ۔ ایک گندم کے دانہ کی جانچ سے تمام گندم کی جو روئے زمین پر ہے حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔ لکھنے والے کی حرکت اُس کی خواہش سے ہی پیدا ہوئی ہے۔ جو انسان کو لاانتہا خوشی حاصل کرنے کی موجود ہے اور ہر انسان کے ساتھ لاشعوری طور موجود ہے۔ جس کا پہلے صفحات میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ ان کی حرکت کی بُنیاد انسان کی خواہش پر ہے۔ چونکہ حرکت کا وجود انسان کے نزدیک ترین ہے اسلئے خود انسان سے بہتر اور کسی جگہ اس حرکت کی تلاشِ حقیقت نہیں کی جا سکتی ہے۔ چونکہ دیگر چیزوں کے ساتھ انسان کو تفاوت جگہ و وقت ہے۔ لیکن حرکت ہی ایک چیز ہے جو انسان کی زندگی ہے گویا نزدیک سے نزدیک چیز ہے۔ اسلئے بہترین آلہ ذاتِ ابدی کی ماہیت حاصل کرنے کے لئے انسان کی حرکت کا جائزہ لینا ہی امورِ بالا کو مدنظر رکھکر واجب ہے۔ یہ حرکت عام طور پر انسان کے افعال سے ظاہر ہوتی ہے۔

ایک شخص سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ حواس خمسہ کی مدد سے انجام پاتے ہیں اور انہی کے ذریعہ ہر ایک فعل انسان کرتا ہے اور یہی دکھائی دیتا ہے کہ ہر فعل یہی احساسات کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات نہیں ہے فعل کرنے والا دل ہے۔ اگر کسی فعل کے ارتکاب میں دل کی اجازت نہ ہو تو جملہ حواس بے بس ہیں۔ اور کوئی فعل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ تمام افعال جو انسان کرتا ہے ان کا واحد کرنے والا دل ہے۔ حواس صرف وہ اوزار ہیں جن کی امداد سے دل حرکت کا اظہار کر سکتا ہے۔ جو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے وہ بذریعہ حواس ہی پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم اس کتاب کے دیکھنے کا فعل کرتے ہیں۔ تو کتاب کی شکل آنکھوں کے ذریعہ دیکھی جاتی ہے۔ اگر دل دیکھنے کا کام نہیں کرتا ہے تو ہم کتاب کو دیکھ نہیں سکتے ہیں۔ اگر ایک شخص جس کو بے ہوشی کی دوائی دی گئی ہو تو وہ زندہ تو ہے۔ لیکن حواس سے کام نہیں لے سکتا ہے۔ عام طور پر یہ حقیقت ہے کہ ہم کسی وقت کسی ایسے خیال میں مستغرق ہیں۔ کہ ہم اپنے سامنے اپنے دوست کو بھی نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ ہماری آنکھیں کھلی ہیں۔ یہ کیوں کہ ہمارا دل کسی اور طرف لگا ہوا ہوتا ہے اور اپنا دھیان اپنے دوست کی طرف جو سامنے کھڑا ہے نہیں ہے۔ چونکہ دل اور آنکھ کا تعلق اسوقت ٹوٹ گیا ہوتا ہے۔

یہاں تک یہ بات مسلمہ ہے کہ جو افعال انسان کرتا ہے۔ بذریعہ حواس خمسہ ہی انجام لاتا ہے اور وہ بذریعہ خیال ہی کرتا ہے۔ گویا ان تمام افعال کا واحد کرنے والا دل ہے۔ جو جو انسان سوچتا ہے اور جسقدر بیرونی اشیائے موجودہ کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے جن میں بے جان اور جاندار شامل ہیں۔ یا اصول و امر مثلاً دوستی۔ صداقت۔ عبادت غرض ہر شے جسکا علم انسان کو ہے سب کچھ خیال سے ہی ہوتا ہے۔ انسان چلتا پھرتا ہے۔ ایجادات و تعمیرات کرتا ہے کسی سے ملتا ہے یا کسی سے محبت یا نفرت کرتا ہے۔ یعنی جو کچھ انسان کا اظہار زندگی ہے

وہ صرف پہلے خیال کے ذریعہ ہی عمل میں لاتا ہے۔ انسان کے تعلقات جو اسکو موجودات عالم کے ساتھ ہیں اسی خیال کا کرشمہ ہے اور انسان تب ہی زندہ تصور ہو سکتا ہے جب وہ افعال کرتا ہے جسکی بنیاد حرکت ہے اور جب حرکت کا اظہار ہے اُسی وقت زندگی کا وجود ثابت اب دیکھنا ہے اس حرکت کا وجود کیسے ہوا ہے۔ کیا یہ آخری بنیاد ہے؟

حرکت انسان تب ہی وجود میں آتی ہے۔ جب انسان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی ہے۔ گویا تمام حرکت کا منبع خواہش ہے۔ اسلئے جسقدر افعال و اعمال کا اظہار اس جہاں میں ہے بلا تحریک خواہش نہیں ہے۔ اس لئے ثابت ہے کہ انسان کے ہر ایک حواس خمسہ کے کرشمہ جات کی ایک محرک خواہش ہے۔ جس سے خیال پیدا ہوتا ہے اور اسکے بعد افعال۔ اسلئے سارے موجودات میں جو حرکت ہے اس کی تہہ میں ایک خواہش کام کرتی ہے۔ خواہش اور خیال میں عام طور پر تفاوت وقت و فاصلہ بہت کم ہونے کی وجہ سے دکھائی دیتا ہے۔ کہ تمام افعال صرف خیال سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل اس خیال کے پیچھے خواہش ہے جو افعال کرانے میں محرک ہے۔ چونکہ ایک بڑی چیز سے ہی چھوٹی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس قیاس سے یہ امر مسلمہ ہے کہ سب موجودات عالم کا منبع خواہش ایک لطیف چیز ہے۔ جس سے اور کثیف چیزیں پیدا ہوتیں ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس ایک آخری چیز ہے جس سے حرکت پیدا ہوئی اور وہ خواہش ہے کسی فعل کے کرنے میں حرکت کی ضرورت ہے۔ اگرچہ وہ فعل بارادہ یا بلا ارادہ ہے لیکن خواہش اس کے ہونے کے ساتھ ہے۔ اس میں اپنے آپ کو خوشی و اطمینان دینے کی غرض ہے۔ اگر افعال کرنے میں بنیادی طور اطمینان نفس خود نہ ہوتا تو خواہش بھی نہ ہوتی اور نہ ہی حرکت اور نہ ہی موجودات نہ ہی حواس خمسہ جن کے لئے موجودات عالم پیدا ہوئے ہیں

اس لئے جہاں خواہش ہے وہاں خوشی کا پہلو ساتھ ہے۔ اسی وجہ موجودات عالم کی پیدائش اوّل خوشی ہے۔ جو کہ خواہش کا بھی سبب ہے۔ اس سے یعنی خوشی سے ہی خواہش پیدا ہوئی۔ اور خواہش کائنات میں موجود ہے۔ عنصر خاک جو ایک عنصر منجملہ پانچ عناصر ہے اس کا وجود بھی اسی خواہش سے ثابت ہے۔ بلکہ اس خواہش میں تمام عناصر اور انکے دیگر ہجوم موجودات کے ہونے کی وجہ ہے۔

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ روزمرہ کے مشاہدہ سے پایا جاتا ہے کہ ایک چھوٹی چیز سے ہی ایک بڑی چیز پیدا ہوتی ہے مثلاً ایک بیج کے دانہ سے ایک بڑا بھاری درخت پیدا ہوتا ہے اور یہی حال بہت ساری چیزوں کا ہے۔ تو کس طرح اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ ایک چھوٹی چیز کی پیدائش کے لئے ایک بڑی چیز کا موجود ہونا لازمی ہے۔ یہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ دنیا میں جو سب سے چھوٹی چیز ہے وہ صرف ایک نقطہ ہے اور اس نقطہ کے اظہار کرنے کے لئے نقطہ سے بڑی چیز ہونی لازمی ہے اس طرح ایک چھوٹے دانہ کے لئے اگر زمین نہ ہوتی گویا دانہ سے بڑی چیز نہ ہوتی تو یہ دانہ نشو ونما نہیں پا سکتا اور بڑا درخت نہیں بن سکتا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ نقطہ کا اظہار کرنے والا نقطہ کی ہستی (ماہیت) کا ہو اور دانہ کے بنانے والا دانہ کی ہی شکل کا ہو۔ اس سے ثابت ہے کہ کسی چیز کے وجود کے لئے اُس چیز سے بڑی چیز کا ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ دونوں بالکل مختلف شکل و صورت کے ہونگے۔ ان باتوں سے واضح ہے کہ عنصر خاک سے خواہش تک موخرالذکر چیز ہی ایک بڑی چیز ہے۔ جس نے اور تمام چیزیں جو خواہش کے عنصر تک ہیں ظہور میں آ گئی ہیں۔ چونکہ خواہش کے ایک چیز ہونے کی صورت میں کسی اور چیز بڑی کہ ہی دیگر ظہورات کے لئے ثابت ہو سکتی ہے۔

حرکت انسان اور خواہش کے ساتھ ایک باقاعدہ نظام بھی ساتھ ہے اور یہ نظام
خواہش سے پہلے ہی موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ نظام خواہش کے ساتھ نہ ہوتا تو قرین قیاس
ہے کہ خواہش سے پیدا شدہ اشیاء کا وجود بھی ممکن نہ ہوتا۔ زندگی کی ہر شے میں ایک
نظام کام کر رہا ہے۔ جس کا پہلے بیان کیا گیا ہے کہ بلا نظام کے زندگی کالعدم ہوتی۔
اس نظام کا موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی ہے
اگر کوئی غلطی ہوتی تو خاک پانی سے اور آگ ہوا سے پیدا نہیں ہو سکتے بلکہ اس کے
بدلے خاک سے ہوا کی پیدائش ہوتی اور بعد میں پانی ہونا ایک بدانتظامی ہوتی
اور جو نظام مکمل ہم محسوس کرتے ہیں۔ نہیں ہوتا۔ جب نظام میں باقاعدگی نہ ہوتی تو
زندگی بھی نہ ہوتی جو بتدریج کئی درجات یکے بعد دیگرے باقاعدہ طے کرنے کے بعد
ظہور میں آئی ہے۔ اس نظام میں جو باقاعدگی موجود ہے وہی عقل سلیم ہے۔

خواہش جو کہ تمام موجودات کی وجہ پیدائش ہے۔ اگر اس میں عقل سلیم
کے عنصر کی بنیاد نہ ہوتی تو زندگی کا ظہور نہیں ہو سکتا۔ ایک سرے پر خاک کا عنصر ایک کثیف
عنصر ہے اور اس کے بتدریج لطیف ہونے کے دیگر عناصر خواہش تک ہیں اور خواہش
کے عنصر سے لطیف تر عنصر جو ہے وہ عقل ہے جو دیگر عناصر سے لطیف ترین عنصر ہے اور
دیگر تمام لطیف و کثیف عناصر اس میں موجود ہیں۔ جس کثیف عناصر خاک۔ آب۔ آتش
و ہوا ایک خلاء کے ان سے لطیف تر یا عنصر میں موجود ہیں۔ اسی طرح عقل سلیم
کے عنصر میں دیگر کثیف عناصر اور خواہش کا ایک لطیف عنصر کی بھی پیدائش
ہوئی ہے۔ خواہش کا عنصر جو لطیف عنصر ہے عقل کے ساتھ نزدیک ترین عنصر ہے
اسلئے دو لطیف عنصروں کا اتصال یقینی ہے۔ در اصل عقل کا عنصر ایک باریک ترین عنصر ہے

جس سے کہ خواہش کا کرشمہ زندگی تا عنصر خاک پیدا ہوتا ہے۔ یعنی عقل کے عنصر میں جملہ عناصر کا ہونا اور ترتیب، زندگی قائم ہے۔ جس طرح ایک لطیف عنصر آگ میں پانی کا ہونا ضروری ہے۔ چونکہ آگ کی ہستی سے ہی پانی کا پیدا ہونا پایا جاتا ہے جس طرح اس حقیقت کو ذہن میں مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح اس حقیقت کو کہ عقل ہی تمام موجودات کی جائے پیدائش ہے لابدی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اگر عقل سلیم نہ ہوتی تو دیگر عناصر بھی نہ ہوتے اور نہ ہی جملہ دیگر اشیاء جو کہ موجودات میں ہیں وجود میں آسکتے۔ اور نہ کوئی شے زندگی کی تعریف میں چونکہ زندگی میں قیام نظام ہے جو بغیر عقل سلیم کے نہیں رہ سکتا ہے۔

جب انسان کوئی فعل کرتا ہے تو وہ خواہش سے ہی ابتداء کرتا ہے۔ لیکن یہ فعل سرزد نہیں ہو سکتا اگر اسکے ساتھ عقل کی بھی اجازت نہ ہو۔ گویا خواہش سے پہلے عقل کا ہونا ضروری ہے۔ خواہش اور عقل دو انفرادی چیزیں ہیں جو کہ حقیقت میں ایک ہی دکھائی دیتی ہیں۔ جسوقت مجھے چلنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور میں چلتا ہوں تو جو میری حرکت چلنے میں ایک خاص ترتیب حرکت قدم و اعضاء ہے۔ یعنی خواہش بھی ہے اور حرکت بھی ہے یہ سارے عنصر بے کار ہیں اگر اس میں عقل کا عنصر نہیں ہوتا تو نہ معلوم میرا چلنا کیا بے قاعدگی پیدا کرتا جو کہ وجہ تباہی ہو سکتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا ہے چونکہ میرے جسم کے عناصر کی پیدائش عقل کے عنصر سے ہی ہوئی ہے۔ اسلئے ہر ذرے میں عقل کی ترتیب ساتھ ہے۔ یہ ایک جادوگر کے عقل کا کرشمہ ہے کہ وہ پٹارے سے قسم قسم کی چیزیں نکال کر تماشہ دکھاتا ہے۔ اگر اس قسم کی عقل جادوگر کے پاس نہ ہوتی تو وہ جادو کے پٹارے سے یہ ساری چیزیں نکال نہیں سکتا۔ یہ عقل ہی کا کرشمہ ہے۔ کہ

تمام اشیاء معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ اس طرح کائنات میں ہر چیز موجود ہے اس کا بنیاد اظہار عقلِ سلیم ہے۔ جو کہ عقل سے کم تر عناصر کی وجہ پیدائش ہے۔ گویا عنصر خاک وغیرہ کثیف و لطیف عناصر صرف عقل سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ ایک عام انسان کو اس بات کو تسلیم کرنے میں شک ہوتا ہے کہ کس طرح عقل سے ہی جملہ اشیائے موجودات پیدا ہوئی ہیں۔ یہ بات روز مرہ کے مشاہدہ سے بخوبی ذہن میں آسکتی ہے کہ مکھن دودھ سے ایک موٹی چیز ہے۔ مکھن کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اسکی اپنی کوئی حقیقت نہیں ہے صرف دودھ ہے جو مکھن سے زیادہ سیال اور باریک چیز ہے۔ لیکن دودھ ہی مکھن کی بنیاد ہے اگرچہ مکھن اور دودھ میں تشکل و شباہت۔ رنگت۔ مزاج وغیرہ خاصیتیں مختلف ہیں۔ اسی طرح پانی کی تشکل اور حقیقت ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور اسکی بناوٹ باریک۔ بلا ذائقہ گیس ہائیڈروجن اور آکسیجن کی ایک خاص ترکیب سے دو باریک لطیف چیزوں میں ہو کر پیدا ہوئی ہے۔ یعنی ایک کثیف چیز پانی دو لطیف چیزوں سے ہی پیدا ہوا ہے اس طرح جملہ عناصر کثیف ایک لطیف عنصر آکاش کے ہونے سے پیدا ہوئے ہیں حالانکہ خاک اور آکاش کے عنصر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسلئے اس بات کو کہ عقل ہی سب موجودات کی بنیاد ہے اور اسی عقل کی بدولت یہ تمام موجودات پیدا ہوئے ہیں ذہن میں بخوبی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ایک آدمی ایک جگہ سے دوسرے مقام پر جاتا ہے۔ یہ کثیف عناصر کا پتلا اپنے جسم کو [illegible] کرچلتا ہے۔ ان عنصروں نے اسکو اس جگہ پر نہیں پہنچایا ہے۔ بلکہ ایک باریک عنصر سے وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک چلا ہے اور وہ خیال ہے نہیں تو اس کے بغیر پاؤں ٹانگیں اور دیگر اعضاء بے کار تھے۔ اور وہ جسم کیا ہے جو اسکے عناصر کو [illegible] باریک تر بنا [illegible]

ایک کثیف چیز خوراک کو ایک نطیف سے لطیف تر چیز بنا کر زندہ رکھ گیا ہے۔ اس بات سے کافی حد تک اشارہ مل سکتا ہے۔ کہ ایک لطیف چیز ہی ایک کثیف چیز کی پیدائش کی وجہ ہے
عقل اور خواہش کے درمیان بالکل باریک تفاوت ہے۔ دونوں باریک ہیں۔ لیکن خاک اور خواہش کے درمیان کافی گنجائش ہے اور اس درمیان جگہ نے دو مختلف چیزیں ذہن میں لا کے رکھی ہیں۔ جو عنصر عقل اور خواہش کے درمیان بالکل نفی کے برابر ہے۔ اس وجہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ خواہش ہی دل اور خیال اور دیگر کثیف عناصر کی وجہ پیدائش ہے۔ تو یہ عقل کہاں سے آگئی ہے۔ یوں تو خواہش کے نہ ہونے سے کاروبار ہستی نہیں رہ سکتا ہے۔ مگر اس بات سے جو ذہن میں شک پڑتا ہے۔ وہ ان دونوں چیزوں کا باریک اور لطیف ہونیکی وجہ ہے۔ دراصل عقل ہی ہے جو کہ خواہش سے لطیف تر چیز ہے جو جملہ موجودات کی وجہ ہے۔

چراغِ راہ

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے

دنیا میں جتنی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں وہ تمام احاطہ قدرت عقل سے پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہ تمام شخصیتیں اس وقت تک کامیاب نہ ہوسکیں جب تک نہ وہ سفلی خواہشات نفس امارہ

سے کنارہ کش ہوتیں) یعنی وہ عام انسانی خواہشات میں گرفتار نہ تھیں۔ وہ ایسی خواہشوں کے لگاؤ سے مبرا تھیں۔ اِن کا معیار زندگی عقل کے حدود میں رہا۔ اس وجہ سے اُن کے کردار و گفتار میں زیادہ سے زیادہ عقل کی وسعت رہی ہے۔ اُن کے ذہن میں عقل کا عنصر غالب رہا ہے اور وہ خواہش کے بیکران سمندر سے دُور عقل کے ساحل پر رہ کر ہی نظام عمل کے تحت کام کرتے رہے۔ اگر وہ خواہش سے مکمل طور منحرف نہ ہوتے اور زیادہ سے زیادہ عقل کے احاطہ میں ہی مسدود رہتے تو اُن کو وہ حیثیت جو اُن کو دنیا میں حاصل ہوئی ہے نہیں ہو سکتی۔ وہ نیک خواہشات کی زد میں رہ کر خواہش کے میدان عمل سے گریز کر نہیں پائے۔ چونکہ اُن کا الحاق زیادہ تر دیگر انسانوں کے ساتھ جو اُن کے معیار عقل سے بہت نیچے درجہ پر تھے۔ رکھنا ضروری تھا۔ اس وجہ سے وہ عام انسانوں کی ذہنیت سے کچھ حد تک مختلف نہیں رہے ہیں۔ خواہش کی پابندیاں ایک عظیم شخصیت کے مالک کو نصب العین حقیقت میں عملاً و فعلاً اپنی ہستی کو کل ہستی میں مدغم ہونے نہیں دیتی ہے جب تک انسان پیکر خاکی کے لبادہ میں ملبوس ہے۔ اس اندازہ سے کیا ایسے عظیم شخصیتوں کو مقصد و منشاء زندگی مکمل طور حاصل کرنے میں کامیاب ہونا تصور میں لا سکتے ہیں۔ زمانہ گذشتہ سے حال تک لاکھوں تبدیلیاں ہو چکیں ہیں۔ کوئی چیز بھی ماحول اور خیالات کی گردش سے خالی نہیں رہتی ہے۔ چنانچہ گردش زمین میں بھی گذشتہ عرصہ دراز کی گردش میں فرق آیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن ایک بڑی چیز میں کوئی ناقابل لحاظ تفاوت بھی آجائے وہ بھی بھاری اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ اسو جہ سے جو کچھ عظیم شخصیتوں کے ارشادات ہیں۔ اسوقت کے انسان کی عقل کے لئے آخری نہیں ہیں۔ اس امر پر غور کر کے یہ لازمی خیال آجاتا ہے کہ دنیا میں ایسے انسان کا ہونا بھی قرین قیاس ہے

کہ جن نے عقل سلیم کے ہوتے ہوئے اظہار عقل کے لئے کسی خواہش کا سہارا نہیں لیا ہے اور اُن کو کوئی انسان اُس طرح نہیں جانتا ہے جس طرح کہ وہ عظیم ہستیوں کو جانتا رہا ہے۔ اس بارے میں اشارتاً یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ ایسے انسان بھی پائے گئے ہیں جن کے متعلق یہ پایا گیا ہے کہ وہ کئی برسوں سے زمین میں مدفون رہے مگر زندہ رہے۔ گویا وہ اس عقل سلیم میں بلا خواہش اظہار رہ چکے ہیں۔ برعکس اُن کے جنہوں نے دنیا میں آکر خواہش کا سہارا لے کر عظیم شخصیتوں کی حیثیت لے کر دُنیا میں پیش ہوئے۔

اس عقل کے عنصر کا اثر دنیا میں کیا رہا۔ ایک تاریخی مثال سے اسکا اشارہ مل سکتا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب دیگر ممالک کی تہذیب سے زیادہ قدیم ہونی پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب کے بغیر جو دیگر ممالک کی قدیم تہذیبیں تھیں وہ سب قدیم تہذیبیں مٹ گئی ہیں۔ ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشان ہمارا

چونکہ اُن قدیم تہذیبوں میں معیار خیال عقل کے حدود تک ہی رہا۔ اس عنصر پر حاوی نہیں رہا۔ زیادہ حواس خمسہ کے کرشمہ جات پر ہی مامور رہا ہے۔ لیکن ہندوستان کی تہذیب اِن کے مقابلے میں ابھی تک قایم ہے۔ اِسکی خاص وجہ یہ ہے کہ اس میں عقل کا عنصر غالب ہوتا رہا۔

ہندوستان کی تہذیب میں انسان کو چار درجات میں منقسم کیا گیا تھا۔ اور اِن میں سب سے اعلےٰ درجہ برہمن کے درجہ کو حاصل ہوا تھا۔ برہمن کو علم روحانیت پر عبور حاصل تھا۔ اور دیگر درجات کے انسانوں کے لئے اُستاد مانا گیا تھا۔ اس قوم میں

ایک خاص دعا خداوند تعالیٰ سے حاصل کرنے کے لئے معرض وجود میں آئی ہے اور یہ دعا برہمن کے لئے مخصوص اور لازمی قرار دیا گیا تھا۔ وہ شخص برہمن کہلانے کا مستحق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جو اس دعا کے سیکھنے اور عمل کرنے سے گریز کرتا۔ اس دعا کے سکھانے اور عمل کرانے کے لئے اسکو ایک اہم ترین شرعی فرض عاید کیا گیا ہے اور اس دعا کی وہی اہمیت ہے جسطرح ایک عام انسان کے زندگی کے قایم رکھنے کے لئے خوراک حاصل کرنی ہے۔ اس دعا کا خاص مطلب اجابت ایزدی کے لئے یہ ہے کہ " اے خداوند مالک جہاں و عالم سفلی و عالم علوی مجھے عقل کی روشنی عطا کر " اور کچھ نہیں صرف استدعا حصول عقل کے سوا اس دعا میں (اور دعا) کوئی نہیں ہے۔ اس دعا کے عمل کرنے کے لئے ابتدائی تربیت دینے کے سلسلے میں اُسی طرح ایک خاص نوعیت کی شرعی پابندی ضروری ہے جس طرح بیاہ شادی کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ گویا اس چھوٹی سی دعا کی تربیت دئے جانے میں ایک مخصوص اور اہم ترین فرض مذہبی عائد کیا گیا ہے جس سے اس دعا کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
پہلے بیان کیا گیا ہے کہ عقل ہی سب موجودات کی بنیاد اور جائے ولادت ہے۔ اس قیاس سے یہ بہت بڑی چیز ہے۔ جس سے کہ دیگر موجودات کا چھوٹا پن عقل کے مقابلے میں بخوبی ذہن میں آسکتا ہے۔ یوں تو ہر مذہب میں ہر قسم کے برگزیدہ انسانوں نے طرح طرح کی دعائیں جن میں زیادہ تر استدعا خلوص دل۔ خلوص نیت۔ ایمانداری۔ فرض شناسی۔ خود شناسی دشمنوں پر فتح۔ حصول دولت و ثروت و خوشی وغیرہ خدا سے حاصل کرنے کی ہوئی ہے۔ لیکن جو دعا خدا سے عقل سلیم حاصل ہونے کے لئے ہوتی ہے۔ ان تمام دعاؤں سے ایک عجیب اور انفرادی نوعیت کی ہے۔ چونکہ عقل وہ عنصر ہے جو تمام نظام قدرت کا منبع ہے۔ اسلئے دیگر دعائیں طلب کرنے میں خواہش شامل ہوتی ہے جو کہ عقل سے ادنیٰ

درجہ کے ظہورات قدرت میں ہے۔ یہی ایک وجہ مسلمہ ہے جس کے باعث ہندوستان کی تہذیب ابھی تک باقی ہے۔ جبکہ دوسرے ممالک کی تہذیبیں مٹ گئی ہیں۔

حضرت مولانا روم کی مثنوی کے متعلق کہا گیا ہے۔

"مثنوی معنوی مولوی۔ ہست قرآن در زبان پہلوی۔"

اس میں اُن کی خاص مناجات جو باری تعالےٰ کے حضور میں پیش کرتا ہے اور جسکی ابتدا "اے بروں از وہم و قال من" سے شروع ہوتی ہے سب سے پہلے جو چیز وہ باریتعالیٰ سے طلب کرتا ہے وہ ہے۔

قطرۂ دانش کہ بخشیدی زپیش۔ متصل گردان بدریاہای خویش

قطرۂ علم است اندر جانِ من۔ وا رہانش از ہوا و خاکِ تن

دانشم آموز تا دانا شوم۔ دیدۂ بخشای تا بینا شوم

وہ صرف عقل کے حاصل کرنے کی دعا کرتا ہے جو دیگر حواس خمسہ کی مسرتوں سے بڑھکر ہے۔ دنیا میں مردانِ مُرتاض احاطہ قدرت عقل میں وابستہ ہیے۔ اسلئے وہ موجودات عالم کے دیگر عناصر پر سبقت حاصل کر کے انسان کے راہبر کہلائے جانے کے مستحق ہوئے ہیں۔ اور دنیا میں جہاں وہ پیدا ہوئے وہ بلحاظ نوعیت مقام۔ تمدن جغرافیائی و آبائی حالات کے انسان کو خاک تا خواہش کے عناصر سے عقل کے مقام پر جہاں پر اُن کا اصلی مقام تھا لانے میں کوشاں رہے۔ جس انسان کو عقل سلیم حاصل ہے۔ اسکو اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا وہ عنصر خاک سے خواہش کے عنصر تک خود بخود قادر ہے۔ اور جس حالت میں حواس خمسہ کے کردار سے اور خواہش کی قدرت سے زندہ ہے۔ اسکی حقیقی طلب لا انتہائی خوشی پر یہ سب عناصر اثر انداز نہیں ہو سکتے ہیں۔

دور حاضرہ میں چند انسان جو موجودہ معیار زندگی کے مطابق نامور ہستیوں میں

لگنے جاتے ہیں۔ تمام انسان کو زیادہ تر خواہشات حواس خمسہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں)۔ اور اسکے نتیجہ کے طور پر وہ انسان کو اُن ارشادات و احکام سابق راہبران کی تلقین ہدایت کے باوجود زیادہ تر چھوٹی اور حقیر چیزوں کے حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ضروریات و جاذبیات حواس خمسہ انسان پورا کرنا چاہتے ہیں۔ جو انسان کو لاانتہا خوشی کے حصول مقصد میں بے ذوق بنانے کا کام کرتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ انسان کے ذہن میں حقیقی مقصد زندگی حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی تمام تر قوت میں جو اُن کو اپنے رُتبہ سے حاصل ہوئی ہے۔ کچھ فیصدی حصہ ہی اُس طریقہ سے صرف کرتے جس طرح وہ انسان کے دیگر ظاہری مشکلات دور کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ ؎

فقط چہرے نہ چمکیں دل بھی چمکیں اہل محفل کے
سراپا نور بن کر دل میں اُنکے ضو فشاں ہو جا

دراصل وہ انسان عظیم کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ جو انسان کو ظاہری تغیر پذیر خوشی دے کر ہی نہیں بلکہ لاانتہا خوشی کی طرف لے جانے کی تلقین کرتا ہے اور جس میں وہ کامیاب رہا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ اہل مغرب نے ہر ممکن کوشش سے زمانہ حال میں انسان کو حواس خمسہ سے حاصل شدہ خوشی دینے کی بڑی ترقی کی ہے اور اسکا نتیجہ و اثر ہم اُسوقت مشاہدہ میں لاسکتے ہیں۔ کہ اہل مغرب کے انسان کو اصلی خوشی و سکون حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔ بلکہ جو خوشی تہذیب حال نے اُسکو دی ہے وہ پُر از خطر و تکلیف دہ ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ اسبارے میں اعداد و شمار قتل و غارت۔ ڈاکہ زنی عصمت دری و دیگر جرائم وغیرہ اخلاق و افعال بد اہل مغرب کے آئے دن اخباروں اور کتابوں میں آتے رہتے ہیں۔ جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ حواس خمسہ سے

خوشی حاصل شدہ سے انسان کو کس قدر ذہنی کوفت ملتی ہے۔ دورِ حاضرہ کی ناموَر ہستیاں اہلِ مغرب کی تہذیب کی تقلید کرتی ہیں۔ جس سے ہمارے قدیمی تہذیب پر جسکی بدولت آج تک ہمارے ملک کی عظمت زندہ ہے۔ اس پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر ایک شخص کو بہترین و نازک ترین پوشاک سے ملبوس کرینگے۔ اور ایک بڑا محل بنا کر دینے سے اور سامان عیش و طرب مہیا کرنے سے۔ انسان کا مقصد و منشائے حیات لا انتہا خوشی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور کیا اُس کا فرضِ انسانی پورا ہوتا ہے۔ کیا اسکی زندگی کا سفر جس سے وہ منزل پر جا سکتا ہے حواس خمسہ کی خوشیاں دے کر ختم ہو سکتا ہے؟ نہیں۔ اگر ہوتا تو ہماری مقدس شخصیتوں نے بھی انسان کے لئے پہلے انہی چیزوں پر توجہ دی ہوتی۔ ایسی بہت کم مثالیں ہیں جو ہم مقدس کتابوں میں پاتے ہیں۔ انسان فانی چیزوں کی تلاش میں اپنی عمر کی معیاد بھی ختم کرتا ہے جس طرح سے موجودہ دور کا نظام چلتا ہے۔ انسان جس کو دیگر حیوانات کے مقابلے میں علم خود آگاہی حصہ تقدیر میں آئی ہے۔ اپنا فرض منصبی انسانیت بخوبی انجام دے سکتا ہے جبکہ وہ حقیر محسوسات کے حاصل کرنے کی تگ و دو میں اپنی زندگی کا سارا وقت ضایع نہ کرے۔ اور اپنے فرضِ زندگی ادا کرنے سے محروم نہ ہو جائے۔ وہ دیگر اشیائے حواس خمسہ کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ جو کبھی پورے طور ختم نہیں ہوتے ہیں۔ چونکہ حواس خمسہ سے حاصل شدہ خوشی میں سکون و اطمینان نہیں ہے۔ مزید اسکی تلاش میں رہنا ایک عادت سی بن جاتی ہے۔ جو انسان کو اپنے فرض پورا کرنے کی راہ سے بے راہ بناتا ہے اور مقصد زندگی بحیثیت اشرف المخلوقات حاصل کرنے سے رہ جاتا ہے۔ انسان کو چھوٹے چیزوں کی خوشی دے کر اسی پر اکتفا نہیں کرتا ہے۔ بلکہ بڑی سے بڑی چیز کی خوشی حاصل کرنے کے لئے اسکی ذہن میں شوق پیدا کرتا ہے۔ چونکہ ایک حقیر چیز کے اکتساب سے

حقیر ہی بن سکتا ہے۔ مگر ہمارا فرض انسانی ایک بہت بڑی چیز کی خوشی حاصل کرنا ہے۔ اسکے مقابلہ میں کم درجہ کی خوشی حاصل کرتے کرتے ہماری زندگی صرف ہوتی ہے جس وجہ سے نظام کلی و مقصد کلی کی ہم آہنگی میں فرق آتا ہے جس کے لئے واحد علاج قدرت سے نظام کے لئے از سر نو تشکیل کی ضرورت بذریعہ بربادی پڑتی ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ہمارے فرض اولین کی انجام دہی کی پھر سے تلقین ہوتی ہے جس سے نظام میں باقاعدگی و ہم آہنگی پھر سے پیدا ہو سکتی ہے۔

لا انتہا خوشی حاصل کرنا مکمل آزادی ہے رنج و غم و کمی سے لیکن اسکو حاصل کرنے کے لئے انسان کو باقاعدہ نظام کے تحت رہنا ہے۔ نظام کی پابندی ایک بڑی شاہراہ ہے جو سیدھی منزل کی طرف جاتی ہے۔ اس شاہراہ پر لاتعداد دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی آزاد راہیں ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی آزادیاں ہیں جن کو حاصل کرنے کی خوشی میں انسان کو اصلی بڑی شاہراہ سے منہ موڑنا پڑتا ہے جس وجہ سے اُس کی منزل مقصود نظروں سے گم ہو جاتی ہے۔ اور انسان اپنے آپ کو آزاد تصور کر کے اپنے حقیقی مقصد زندگی کے حاصل کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔

دورِ حاضرہ کی آزادی کا مقصد حواس خمسہ کی مکمل آزادی کا عمل ہے یعنی جس قدر خواہشات حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہیں بلا کسی پابندی کے انسان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کوشش میں نیک اصول، اخلاق نیک و بد میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا ہے۔ گویا عقل کی پابندی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس آزادی کا اصل مقصد ہے جو آج کل کے انسان میں لاشعوری طور اُن نتایج کے زیر اثر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جو نتائج ترقی تمدن کے ذرائع کو استعمال میں لائے جانے سے پیدا

ہوئے ہیں۔ اگر اُن عناصر کو بھی جن سے حواس خمسہ تاثرات لے کر عمل کرتے ہیں آزادی دی جائے تو سارے نظام میں ایک مجموعہ بے ترتیبی و بد انتظامی پیدا ہو سکتی ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر زندگی مفقود ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک مکان کے پتھروں اور اینٹوں کو بھی آزادی دی جائے تو کیا مکان رہ سکتا ہے۔ اور جس مقصد کے لئے مکان تعمیر ہوا ہے کیا وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ معمولی چیزیں بھی ایک قاعدہ کے تحت پابند نظام ہیں جس سے ایک اعلےٰ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے عیاں ہے کہ موجودہ دور میں حواس خمسہ کا راج ہے جس میں عقل انسانی کی قوت کو دبا رکھا گیا ہے۔ یہی ایک وجہ ہے جس سے موجودہ دور کے عام انسان کا ذہن پریشانی و بے اطمینانی میں مبتلا ہو چکا ہے۔ چونکہ نیک خصائل و نیک اوصاف کی قوتوں کو بھی کچھ عرصہ کے لئے اخلاق و اعمال بد کی حیوانی قوت کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ اور نظام کی ہم آہنگی میں خلل ہوتا ہے جس کے لئے درستی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ حالانکہ اس عقل کے عنصر کو ازل سے ہی اس سے نیچے درجہ کے تمام عنصر پر قدرت حاصل ہے بقول علامہ اقبال۔ ؎

ہر خاکی و نوری پر حکومت ہے خرد کی
باہر نہیں کوئی عقل خدا داد کی زد سے

اسو جہ آگے اس بات کی تلقین بھی کی ہے کہ ؎

فطرت کو خرد کے روبرو کر　　　تسخیر مقام رنگ و بو کر۔

لیکن ستم ظریفی ہے۔ کہ آج کل خواس خمسہ کی رنگینیوں نے ہی انسانی فطرت پر تصرف کیا ہے جس وجہ سے خرابی پیدا ہوئی۔ اور تب تک یہ خرابی دور نہیں ہو سکتی ہے جب تک نہ انسان اپنی عقل کی قوت سے حواس کی طاقتوں پر غلبہ حاصل کر کے اس خوشی سے محظوظ ہو جائے

جو صرف عقل سلیم ہی دے سکتی ہے۔

مشاہدہ عام سے یہ بات واضح ہے اور مسلّم الثبوت ہے کہ ہماری زمین کسی اور چیز کے پہلے ہی موجود ہونے سے وجود میں آئی ہے۔ جسے آج سائنس نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ایک لطیف چیز سے ہی ایک کثیف چیز کی پیدائش ہوئی ہے۔ عقل جیسی ایک لطیف چیز کے لئے بھی کوئی اس سے لطیف تر اور بڑی چیز پیدا ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اسلئے اُس چیز کی جس سے عقل کی پیدائش ہے قرین قیاس ہونا ناگزیر ہے۔ اسلئے کہ عقل بھی ایک عنصر ہے جو چیزوں میں شامل ہے۔ اس طور عقل کی بھی ایک انفرادیت قایم ہے۔ اِسلئے اُس بڑی چیز کی تلاش کرنی لازمی ہے۔ جس پر عقل کا عنصر ٹھہرا ہوا ہے بلکہ جس سے یہ پیدا ہوئی ہے۔ چونکہ ایک چیز چاہیئے وہ لطیف یا کثیف ہو دوسری چیز کے سہارے یا جائے پیدائش کے بغیر موجودات کے شمار میں نہیں لائی جاسکتی ہے۔

قبل اسکے کہ مضمون زیر بحث کو ختم کیا جائے۔ اس بات کا اِعادہ کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ ذہن میں بنیادی تصور قریب تر رکھکر اسکے بعد تسلسل میں رکاوٹ نہ پڑے۔ جس قدر کثیف چیزیں وجود میں آئی ہیں۔ اُن کے تصور میں لانے سے یا حقیقی طور تجربہ کرنے سے عیاں ہے۔ کہ اِن تمام چیزوں میں ایک تفاوت جگہ ہے جو ایک چیز کو دوسرے کے درمیان ہے اور بوجہ حرکت ایک چیز کا خیال کرکے دوسری چیز کے ذہن میں آنے سے اِس جگہ اور وقت کا ہونا لازمی ہے۔ جس قدر باریک سے باریک ترین چیزیں ہوتی ہیں ان میں جگہ اور وقت میں اتنی ہی کمی آجاتی ہے۔ یعنی جس وقت ہم خلاء اور ہوا کو ذہن میں لاتے ہیں تو تفاوت جگہ و وقت کم رہتی ہے۔ برعکس اِسکے کہ خلاء کے بعد زمین کو تصور میں لایا جائے تو اِسمیں کافی جگہ اور وقت کی

ضرورت ہے چونکہ خلاء کا زمین بن جانا براہ راست و بطریق معمول ہے یعنی پہلے ہوا اسکے بعد آگ اور بعد میں خاک اور یہ ایک خاص عمل سے ایسا ہوتا ہے۔ جب تک یہ عمل نہ ہو ایک لطیف چیز سے ایک کثیف چیز نہیں بن سکتی ہے۔ لیکن دو لطیف چیزوں کا تصور میں لایا جانا ہوگا تو وقت اور فاصلہ اِن دونوں چیزوں کے ذہن میں لائے جانے سے بہت کم رہتا ہے۔ خلاء کے ساتھ جو نزدیک چیز ہے وہ حرکت ہے۔ گویا خلاء اور حرکت ایک ہی چیز دکھائی دیتی ہے۔ اِس تصور کے ساتھ خواہش جو وجہ حرکت ہے اور اس حرکت کی باقاعدگی یعنی عقل کا عنصر آنے سے یہ بات ذہن قبول کرتا ہے۔ کہ پورا عالم ایک نظام کے تحت وجود میں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت ہم عقل جیسی بڑی چیز کی تلاش جائے ولادت کرتے ہیں۔ تو وقت اور وسعت ختم ہو کر اسکی جائے ولادت صرف لکھنے والے یا پڑھنے والے کی انا (میں) کی طرف قدرتی طور ظاہر ہوتی ہے۔ چونکہ عقل کی حد تک جتنے موجودات ہم نے ذہن میں لائے ہیں۔ اُن کی جائے پیدائش عقل کو ہی ذہن میں رکھا ہے۔ تو کس طرح خیال اُن چیزوں کی طرف بغرض تلاش جائے پیدائش عقل جا سکتا ہے۔ یہ دماغ سوزی۔ لکھنا۔ پڑھنا اور خواہش وغیرہ لا انتہا خوشی کی تلاش صرف اس انا کو ہے اور کسی کو نہیں۔

سُراغِ مُستحکم

جس طرح خاک کا وجود جو تمام کائنات میں ہے اور جس کے ساتھ ذہنی شکل و صورت و دیگر امورات

دالبستہ میں نہ تمام دیکھے نہیں جا سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اُمورات جو کل کائینات کے خاک کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس لئے جزوی حصہ خاک کو لے کر ہی تمام عنصر خاک کا جو کائینات میں ہے اندازہ لگا سکتے ہیں اور اسکے بعد دیگر امورات متعلقہ کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں ہم اسوجہ سے تمام خاک نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ چونکہ ہماری آنکھوں اور جسم کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے۔ اِس طرح کل کائینات کو مکمل طور نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر دیکھا جاتا تو ہم بھی آنکھوں سے یا ذہن سے عقل کُل کے متعلق جان سکتے کہ کس چیز پر قایئم ہے۔ یعنی کل "میں" بھی دیکھ سکتے۔ اور جو نزدیک ترین چیز ہمارے پاس ہے اور جسکا اندازہ ہم لگا سکتے ہیں وہ انسانی جسم کا "میں" ہے۔ اسکے اجتماعی اور تجزیاتی مطالعہ کے ذریعہ ہی ہم کل کائینات کی لوازمات و خصوصیات کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چونکہ جہاں وقت اور فاصلہ دو چیزوں کے درمیان کم ہے اور ایک چیز جو دوسری چیز کے نزدیک ہے تو ہمارا اندازہ جو درمیانی فاصلہ ہونے کی وجہ سے مکمل نہیں ہے بوجہ نزدیکی کے بہت حد تک مکمل ہو سکتا ہے۔ اگر ایک مُدوّر چیز پر ایک نقطہ باہری سطح پر لگا یا جائے تو وہ نقطہ اس گول چیز کے محیط کا مرکز ہے۔ اور جتنے نقاط اس گول چیز کے محیط پر ہیں۔ صرف ایک نقطہ کو جان کر ہی تمام دیگر نقاط کی حقیقت کا علم ہو سکتا ہے۔ بلکہ تمام گول چیز کا۔ اسی طرح ایک مکمل نظام میں ہر ذرہ اس نظام کے محیط میں ایک مرکز کی مانند ہے اور اس مرکز سے محیط تک کسی ایک نقطہ کا علم حاصل ہو جائے تو تمام دیگر ذرات کے ہونے کی حیثیت کا پتہ لگ سکتا ہے۔

جسقدر بھی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے لکھنے سے پہلے یا ان خیالات کے پڑھنے کے ساتھ دیگر ہجوم و بیجان خیالات تصور میں آتے ہیں۔ اور ان میں ترک و ایجاب کا کرشمہ بھی ذہن میں آتا ہے۔ ایسا خیال لازماً آتا ہے کہ یہ سب ذہن میں آئے۔ آتے جاتے

رہینگے۔ لیکن اس تمام شعبدہ بازی میں ایک "میں" ہی یعنی "انا" ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ جو بطور مرکز کے کام کرتا ہے اور اسکے پس وپیش جملہ خیالات پریشان ودیگر اشیائے موجودہ کے تصورات بطور محیط رواں دواں رہتے ہیں۔ اسلئے مجموعی طور پر جملہ اشیاء کا جن کا وجود تصور میں یا حقیقی طور تجربہ میں آتے ہیں۔ ان تمام چیزوں میں ایک "میں" ہی حادی رہا ہے اور وہ یہ نقطہ ہے جو اس کائینات میں تمام موجودات محیط کا مرکز ہے۔ اگرچہ صرف اس نقطہ کا خیال ہی آتا ہے۔ لیکن اس نقطہ میں تمام دفاتر علم و دانش کے کرشمہ جات زندگی موجود اور قایم ہیں اور یہی مرکز عقل اور اسکے دیگر درجات کے عناصر کی جائے ولادت ہے۔
اس سے ثابت ہے۔ کہ عقل جیسی بڑی چیز جو اسوقت تک کل عناصر کی جائے پیدائش ہے اپنے سے بڑی ایک اور چیز پر قایم ہے اور وہ بڑی چیز "انا" ہے جو جسم انسانی میں موجود ہے۔
عام چیزوں میں جو عقل سے بڑی ہیں وہ عقل رکھنے والا عاقل ہے اور وہ انسان ہے جس میں عقل کل کا جزو موجود ہے۔ اس جزو کل سے انسان نے تمام ایجادات سابق وحال کا وجود دنیا میں لایا ہے۔ گویا عقل سے چھوٹے درجہ کے جو عناصر ہیں اُن پر قابو پاکر انسان سائینس وفلسفہ کا موجد بن گیا ہے۔ اگر ان تمام ایجادات میں انسان نے عقل کا جزو استعمال نہ کیا ہوتا تو یہ سب کرشمہ جات سائینس وفلسفہ وجود میں نہیں آسکتے۔
اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ دراصل ایک لطیف عنصر سے کثیف عناصر کی پیدائش ہوئی ہے۔ اسلئے عقل جیسی لطیف چیز سے بڑھکر جو چیز ہے وہ عقل سے لطیف تر چیز انسان کی "انا" ہے۔ جو انسان کے وجود اور ہستی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ "انا" یا "میں" کیا ہے؟ خاک ہے یا دیگر عناصر یا عقل ہے بلکہ ان تمام کا ایک لطیف مرکب ہے اور ان چیزوں کی کیفیت اور روح ہے وہی "میں" ہے۔ اب یہ سوال ہے کہ کیا پھر تشکیل مرکب

عناصر ہی اس "میں" کے ہونے کی دلیل ہے؟ نہیں چونکہ جیسا پہلے کہا گیا ہے کہ عقل اور دیگر عناصر میں صرف ایک بڑی چیز عقل ہے اور عقل سے بڑی چیز "میں" ہے۔ اسلئے چھوٹی چیزوں کے ہونے یا نہ ہونے سے بڑی چیز کی ہستی پر کوئی نابود ہونے کا اثر نہیں پڑتا ہے۔

"میں" کو کہنے والا ایک انسان ہے اور انسان کے لئے جسم کا ہونا ضروری ہے گویا اس "میں" کو کہنے کے لئے ایک مخصوص مشین کی ضرورت ہے۔ اگر جسم نہ ہوتا تو "میں" کو میں کہنے والا بھی نہ ہوتا اور جسم جملہ عناصر خواہش اور عقل کی ترتیب سے بن گیا ہے۔

میری قدرت کا کرشمہ ہے یہ انسانی وجود !!
جس کے سب فعلوں کا شاہد ہوں میں برتر از مشہود ہے گیا

اس پیکر خاکی کے وجود سے ایک "میں" کا اظہار ہوا ہے۔ اس "میں" کو جسم کے ساتھ ایک لگاؤ ہے اور اس لگاؤ میں ایک تنہائی یعنی انفرادیت ذاتی اس "میں" کی ہے میرا سر۔ میرا پیر۔ میرا بدن وغیرہ جو اس جسم عنصری کے ساتھ ہیں۔ وہ اس جسم کے نہیں ہیں۔ وہ اس "میں" کے ہیں جو میرے کہنے سے ہیں۔ گویا جن عناصر سے یہ جسم بنا ہوا ہے۔ ان عناصر کا یہ جسم نہیں ہے بلکہ اس "میں" کا ہے جس کو ہم نے سب عناصر سے ایک بڑی چیز تسلیم کیا ہے۔ "میں" کے بغیر جسم فضول ہے اور بے جان ہے۔ لیکن "میں" جسم کے بغیر بے جان نہیں ہے۔

یہ کبھی پیدا نہیں ہوتی فنا ہوتی نہیں — جسم میں آتی نہیں آکر جُدا ہوتی نہیں
یہ ہمیشہ پاک و برتر ہے کسی اور نقص سے — اسکی موت آتی نہیں مٹنے سے خاکی جسم کے "گیتا"

یہ جسم کے ہر ایک ذرے کو میرا کہنے سے بخوبی ثابت ہے کہ اس میں کے اظہار کے لئے اس جسم کا

وجود ہوا ہے۔ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ چھوٹی چیز کے اظہار کے لئے ایک بڑی چیز کا ہونا لازمی ہے اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ جملہ عناصر عقل نے کر اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی چیزیں ہیں۔ اس وجہ سے "میں" ایک بڑی چیز ہے۔ جس نے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اپنے اظہار کے لئے استعمال میں لایا ہے۔ اگر یہ چھوٹی چیزیں نہ بھی ہوں تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ بڑی چیز بھی کالعدم ہوتی ہے۔ چونکہ جو چیز کسی دوسری چیز کو اپنے استعمال میں لاتا ہے تو استعمال کرنے والی چیز ہی بڑی ہے۔ اس قیاس سے اگر جسم فنا بھی ہو جائے تو "میں" پھر بھی رہ سکتا ہے۔

وہ شے اور ہے کہتے ہیں جان پاک جسے
یہ رنگ و نم یہ لہو آب و نان کی ہے بیشی "اقبال"

گلاب کے پھول کی پتیاں ختم بھی ہو جائیں۔ لیکن اسکی کیمیائی ترکیب سے اسکی خوشبو حاصل ہوتی ہے۔ وہ گلاب کے لئے آخری چیز ہے جو پہلے گلاب کے پھول کے رگ و ریشہ میں موجود تھی۔ اور اس خوشبو کے اظہار ہونے سے گلاب کا پھول ظاہر ہوا ہے۔ در اصل یہ اس خوشبو کا ہی کرشمہ ہے کہ گلاب کا پھول بن گیا ہے۔ جو کہ تمام رگ و ریشہ اور اسکی جڑ۔ اسکے پتے اور اُگ جانے کا مقصد رہا ہے۔ جو اس گلاب کے پھول سے گریزاں ہی رہی۔

اس میں مجھ میں ربط ہے گویا مثال رنگ و بو
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا "ذوق"

یہی رشتہ ہمارے "میں" اور ہمارے جسم کا ہے۔ چونکہ موخر الذکر فانی ہے اور اسی روح کے لئے جسم بنا ہے۔ بلکہ روح نے ہی اس پیکر خاکی کو وجود میں لایا ہے۔ موجودہ سائنس کے ایک اہم کرشمہ سے بھی یہ بات واضح ہو سکتی ہے۔ اگر ہم یہ تصور کریں کہ "چاند پر آدمی کا اُترنا"

بھی ایک چیز ہے ایک مقصد۔ ایک روح ہے کسی خیال کا تو اس خیال کو پورا کرنے کے لئے اس کام میں تمام چھوٹی چھوٹی چیزیں ، ہتھیار ۔ اوزار ۔ حساب کتاب ۔ آدمی ۔ سائنس داں ۔ وقت و وُسعت ۔ لاکھوں روپیہ اور محنت اور دماغ سوزی اس خیال کو پورا کرنے کے لئے لگائی گئیں ہیں ۔ وہ خیال ہے "چاند پر آدمی کا اُترنا" جو ایک موجود چیز ہے ۔ لیکن اسکے اظہار کے لئے جتنی چیزیں استعمال میں لائی گئی ہیں ۔ وہ صرف ذریعہ کے طور پر استعمال ہوئیں ہیں چونکہ ایک بڑی چیز ہے ۔ اسکو منظر شہود پر لانے کے لئے جن چیزوں کو استعمال کیا گیا ہے وہ بڑی نہیں ہیں ۔ وہ تمام اس سے چھوٹی ہیں ۔ اس طرح انسانی روح کا کرشمہ ہے جس نے تمام مدارج ترقی میں تمام عناصر کو استعمال میں لاکر جسم بنا کر اس آخری شکل "بشر" کا اظہار کیا ہے ۔ بڑی چیز وہی ہے جو اور چیزوں کو اپنے استعمال میں لائے ۔ اسلئے انسان میں جو "انا" ہے وہ بڑی چیز ہے جس نے تمام دیگر چیزوں کو اپنے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے ۔ چونکہ اس دلیل سے کہ خیال پہلے ہی موجود تھا ۔ اس طرح پہلے ہی روح کا موجود ہونا ضروری ہے اگر موجود نہ ہوتا تو جسم کے بنانے کی ضرورت نہ تھی ۔ ہمارے سامنے منزل ہی ایک بڑی چیز ہے ۔ اسی وجہ سے انسان منزل پر جانے کے لئے جتنی چیزیں استعمال کرتا ہے ۔ مثلاً ریل ۔ جہاز وغیرہ وغیرہ ذرائع ریل ورسایل جو ہم کو بڑی چیزیں دکھائی دیتی ہیں دراصل وہ چھوٹی چیزیں ہیں منزل پر پہنچنے کے مقابلہ میں ۔

نشانِ منزل

ہمارے ذہن میں یہ بات عام مشاہدے سے ثابت ہوئی ہے ۔ کہ جسم جبلہ عناصر کی

ترکیب سے پیدا ہوا ہے۔ اگر ہمارے پاس، پتھر۔ اینٹ۔ لکڑی وغیرہ مسالہ موجود بھی ہے جب تک نہ اُن کو ایک ترتیب سے ایک ڈھنگ سے استعمال کیا جائے۔ اور اُن کے استعمال کرنے کی اہمیت نہ ہوگی تو مکان تعمیر نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہمارا جسم بھی عقل کے موجود ہونے سے ہی پیدا ہوا ہے اور اس میں خاک کے عنصر سے عقل تک تمام کام کر رہے ہیں۔ گویا جملہ عناصر صرف جسم کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ جس طرح جسم انسان صرف "میں" کے اظہار کے لئے ہی ضروری تصور کیا گیا ہے۔ ہماری دنیا کا ہر ذرہ ایک انفرادی جسم ہے۔ یعنی جو چیز ہم اپنے حواس خمسہ سے محسوس کرتے ہیں سب جسم کی تعریف میں آتے ہیں۔

قادر مطلق ہے کل جسموں کے اندر جلوہ گر

سب کو حکمت سے پھراتا ہے صفاتی چرخ پر

اسی طرح کل کائنات بھی اظہار کل "میں" کے لئے ہی پیدا ہوئی۔ اس آگہی کا احساس شعوری یا لاشعوری طور پر اور کسی جسم میں اس حدِ ادراک تک نہیں ہے جس حد تک یہ جسم انسانی میں ہے۔ یہی فرق دیگر اجسام اور جسم انسانی میں ہے۔

پہلے کہی گئی باتوں سے ہم نے یہ تسلیم کیا کہ عقل بڑی چیز ہے اور یہی دیگر اشیائے موجودہ کی بنیاد ہے۔ گویا عقل بھی ایک چیز ہے اور اس چیز کی پیدائش کے لئے اس سے بڑی چیز کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور اُس بڑی چیز کو بھی پا لیا ہے۔ اور وہ جسم انسانی میں "انا" ہے۔ اسلئے اس انا کی بھی ایک انفرادیت ہے اور چیزوں کی تعریف میں آسکتی ہے۔ اسلئے اس بڑی چیز "انا" کے لئے بھی ایک اور بڑی چیز ہونی لازمی ہے۔ جس بڑی چیز کے ہونے سے اس چیز کی انفرادیت ثابت ہو چونکہ یہ انا بھی کسی چیز پر ٹھہر کر ہی سارا کاروبارِ پیدائش کائنات کرتا ہے۔ پس تو اس بڑی چیز کے لئے معنوی طور

جگہ تلاش کرنی، جس سے یہ بڑی چیز پیدا ہوتی ہے۔ بہت آسان دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ ہم نے "میں" کو انسان کے جسم میں ہی پایا ہے گویا "میں" کے لئے اس سے بڑی چیز ہمارا جسم ہی تو ہے۔ مگر یہ غلط ہے جسم چونکہ عناصر سے پیدا ہوا ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ عناصر کو کسی اور چیز سے پیدا ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ تو پھر "انا" کو کس طرح جسم انسان سے پیدا ہونا مان سکتے ہیں۔ چونکہ چھوٹی چیز ہمیشہ بڑی چیز سے ہی پیدا ہوتی ہے اور اس "انا" کو دیگر عناصر سے بہت بڑی چیز قرار دیا گیا۔ اسلئے ہم "انا" کو جسم سے پیدا ہونا تسلیم نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ ایسا کرنا عقل جیسی بڑی چیز کو دیگر عناصر کے مقابلے کمتر درجہ دینا ہوگا۔ چونکہ دیگر عناصر کی جائے پیدائش عقل ہی ہے۔ اسلئے جسم کو عقل سے بڑا درجہ دیکر "میں" کی جائے پیدائش تسلیم کرنا خلاف تنظیم عقل و منطق ہے۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ آسمان اور زمین کے قلابے ملاتے ہیں ہوائی قلعے اور تخیلات کے سمندروں کو بناتے ہیں۔ بگاڑتے ہیں۔ وہ میں کرتا ہوں۔ یہ ساری چیزیں میں کر سکتا ہوں۔ جبکہ میں کے ساتھ میرا ہونا ہے۔ گویا میں کے ہونے نے ہی اس "میں" کو زندگی بخشی ہے۔ اگر میرے ساتھ میرا ہونا نہیں ہوتا تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اسلئے اس "انا" کی پیدائش ہونا ہستی ہے جو "میں" سے بڑھکر ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ جملہ موجودات کی بنیاد مجموعی طور پر اور انفرادی طور پر یہی ہستی "ہونا" ہے جو دیگر عناصر اس سے چھوٹے ہیں اُن کی وجہ تخلیق ہے۔ اگر یہ ہستی نہ ہوتی تو یہ ننھے منے عناصر بیچارے کہاں پیدا ہوتے۔ ہونے ہی نے اُن کو جسم دیا ہے۔ اگر کائینات کے وجود سے تمام اسماء۔ افعال۔ اشکال خارج بھی کرینگے تو باقی صرف ہونا رہ جائیگا۔ اور میں "انا" جیسی بڑی چیز کے نہ ہونے سے بھی ہونا موجود ہے۔ چونکہ ہونا انکار ہونا میں زندہ ہے۔

عدم اور ہستی بھی کسی چیز پر ہی قایم ہو کر تصور میں آتے ہیں۔ اسلئے ہستی لازوال ہے۔ اسلئے کائینات کا ہر ذرہ جس کا کوئی نہ کوئی نام اور شکل ہے ایک جسم رکھتا اور زبان بے زبانی سے یہی کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ میں ہوں اور زندہ ہوں۔ ایک لطیف احساس رکھنے والا انسان سرشار خوشی ہو کر اس حساس ہستی کا اظہار کرتا ہے کہ :-

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ غالب

مذکورہ بحث سے اب یہ حقیقت بخوبی ذہن نشین ہوتی ہے کہ ایک چھوٹی چیز کی پیدائش اُس سے ایک بڑی چیز سے ہوتی ہے۔ اس تجربہ اور تجزیہ سے آخیر پر ہونے کو ہی تمام موجودات میں ایک بڑی سے بڑی چیز بلا شک وشبہ تسلیم کیا ہے جو تمام عناصر خاک سے لے کر "انا" کی جائے پیدائش ہے۔ اب اس بڑی سے بڑی چیز ہستی کے لئے بھی اسکی جائے پیدائش تلاش کرنی واجب ہے۔ جو اس "ہونے" کا سبب ہو۔ ایسی چیز کو ہم کہاں سے لائینگے۔ چونکہ موجودات کائینات میں ہم نے "انا" کو ہی آخیری عنصر پایا ہے۔ اسلئے ہونا کے لئے اور کوئی چیز نہیں رہ گئی جس کو ہم ہونے کی وجہ پیدائش تسلیم کرتے یعنی سب سے آخیر ٹھوس خاک جسکی پیدائش دیگر لطیف عناصر سے ہوئی ہے۔ تو اسکے دائیں بائیں اوپر نیچے گھوم کر دیکھیں تو کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی ہے جس کو ہم اس "ہونے" کی وجہ بتا سکتے ہیں۔ لیکن کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی ہے۔ چونکہ جسقدر چیزیں وجود میں آئی ہیں اُن کو ایک دوسرے کا وجہ وجود پایا ہے اور آخیر پر میں یعنی "انا" ملا ہے اور اسکی پیدائش بھی "ہونے" میں پائی ہے اور خاک کے عنصر میں بھی یہ چیز ہونا پائی گئی ہے۔ گویا خاک کے عنصر میں بھی ہونا ہے اور آخیر عنصر بھی ہونا ہے۔ یعنی ایک لطیف

ترین چیز کی ابتدا بھی ہونا ہے اور اس سے کثیف ترین چیز کے بعد بھی ہونا ہے۔ اسی وجہ سے
تمام موجودات عالم میں ہونا قائم ہے۔ اگرچہ ان جملہ عناصر کے تجزیہ کرنے کے وقت اس ہونے
کی طرف ہماری توجہ رہی یا نہ رہی ہو۔ یہی ابتدائی نقطہ ہے اور آخر پر بھی یہی نقطہ
ہے جس میں کوئی تفاوت ہستی نہیں ہے۔ کائنات میں کوئی ایسی شے موجود نہیں ہے جس کی
ابتدا اور انتہا یکساں ہے۔ اگر ہے تو وہ صرف ہستی ہونا ہے۔ اسلئے کائنات میں
کوئی ایسی دیگر شے نہیں ہے کہ جس کو ہم ہونے کا وجہ وجود تسلیم کرتے۔ اگر تمام ظہورات
بیک قلم نیست و نابود ہو جائیں۔ پھر بھی ہونا باقی ہے۔ اس ہونے کا کوئی خاتمہ نہیں ہو
سکتا ہے اور نہ ہی یہ چیز کسی اور چیز سے پیدا ہوئی ہے۔ گویا یہ ایک سب سے بڑی
چیز ہے۔ جس سے اور چیزوں کی پیدائش ہوئی ہے اور خود کسی چیز سے پیدا نہیں ہوئی
ہے۔ اور نہ کوئی ایسی دوسری چیز ہے جو اُسکو نابود کر سکتی ہے۔ چونکہ اس ہونے
سے چھوٹی چیزیں رہیں یا نہ رہیں بڑی چیز بدستور قائم رہیگی۔ اسلئے اُجنما ہے۔ امر ہے
جو ہر ایک عنصر میں موجود ہے۔ بلکہ ہر ایک عنصر کے ہر ذرے میں قائم اور مسلسل ہے اگر ذرہ
ختم بھی ہوگا تو اس ذرے کی ہستی موجود رہیگی جو کہ جزو تمام ہستی ہوگا۔ یہ ہونا حیات و
ممات کی قید سے آزاد ہے۔ اس تجربہ سے یہ بات واضح طور ثابت ہوتی ہے کہ اس موجودات
میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو کبھی پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی اسکی موت ہے۔ چونکہ تمام
موجودات کے نام و ہیت و صورت میں تبدیلی آسکتی ہے اور تمام چیزوں کی حیات و
ممات کی قید سے آزادی نہیں ہے۔ یہاں حیات سے مطلب ہے کہ جو چیز کبھی پیدا ہوئی
ہے کسی اور چیز سے یا کسی اور ذریعہ سے اور موت سے مطلب ہے کسی پیدا ہوئی چیز کا
تبدیل ہیت کرنا یا ختم ہونا۔ لیکن یہ دونوں صورتیں اس ہونے میں نہیں ہیں۔ بلکہ

موجودات کے ہر ذرہ میں ہونا قائم ہے اور پیدائش و موت کی دونوں صورتوں میں ہر شے میں موجود اور مثبت ہے۔ دیگر شے موجودات میں حیات و ممات ٹھوس عقل سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن اس ہستی میں یعنی اس چیز میں یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں۔ یہی وہ شئی الطیف ہے جو ابتدائی امورات میں تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس ہستی الطیف کا وجود کوئی مبہم یا فضول نہیں ہے۔ اسکا وجود قائم ہے جو کسی باریک سے باریک ترین یا لطیف سے لطیف ترین ذہن یا آلہ جات عقل انسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے یہ دیگر موجودات سے جدا ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی اس طرح سے ٹھوس چیز نہیں ہے جس طرح سے دیگر چیزیں ہیں چونکہ جتنی الطیف ترین و کثیف ترین چیزیں ہیں وہ اس "ہونے" سے پیدا ہوئیں ہیں جس کی کوئی شکل و صورت نہیں ہے اور نہ ہی وسعت و وقت کی پابندی اس پر لاگو ہے۔ چونکہ وقت اور وسعت اسکے مقابلہ میں بہت معمولی چیزیں ہیں۔ ہستی ہی ان عام چیزوں کی جائے پیدائش ہے۔ اس کی حقیقت باریک سے باریک چیزوں سے پرے ہے بلکہ انسان اور تمام موجودات میں جسقدر افضل ترین صفات موجود ہیں یا ذہن انسان میں آسکتے ہیں وہ اس "ہونے" ہی کے ساتھ لاگو ہیں اور اُن سے پرے بھی ہے۔

اس ہستی لازوال کا علم کس کو ہے۔ یہ اس "انا" کو ہے اور وہ "میں" کہنے والا انسان ہے۔ اس لئے وہ خود آگاہ ہے اور اشرف المخلوقات ہونے کا درجہ حاصل کیا ہے۔ چونکہ جملہ مخلوقات میں صرف انسان کی تقدیر میں اُسکا علم آیا ہے اور یہ علم انسان کی روح میں شعوری یا لاشعوری طور پر موجود ہے۔ جس انسان کو یہ علم ذہن میں شعوری طور موجود ہے وہی خود آگاہ ہے۔ میں "انا" کیا ہے۔ اُن مدارج ترقی کے

باریک ترین چیز بن جانیکی ایک آخیری اور انفرادی چیز ہے۔ ایک خاک کا ذرہ جو کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد انفرادیت حاصل کر چکا ہے۔ چونکہ ہمارے جسم کی ابتدا خاک کے عنصر سے ہوئی ہے اور اس خاک کے ذرے کو "میں" کی چیز میں نمودار ہونے کے لئے ہزاروں مختلف کیمیائی منزلوں سے یعنی تمام عناصروں خواہش و عقل کے بھٹی کے تجربوں سے گذر کر ماہیت و حقیقت تبدیل کر کے ایک انفرادی حقیقت "انا" کی تعریف میں آچکا ہے۔ اسوجہ سے جن منزلوں سے یہ گذرا ہے اُن کے لطیف ترین چیزوں کا مرکب ہو کر ایک انفرادی حیثیت لے کر انسان کے جسم میں ظاہر ہوا ہے۔ اسی کا اشارہ ہے کہ

تیرے اور میرے بہت اجسام پہلے ہو چکے

تو ہے ناواقف مگر واقف ہوں میں اس راز سے "گیتا"

چونکہ تمام عنصروں کی باریک اور لطیف چیز ہے۔ اسکو ایک اور باریک تر اور لطیف تر چیز کے ساتھ بمقابلہ خود تفاوت جگہ و وقت بہت کم رہتی ہے۔ اگرچہ اس میں ایک طرف تمام عناصر کی لطافت ہے اور دوسری طرف ہستی لازوال ہے جو کہ تمام موجودات عالم کے چیزوں اور عنصروں سے باریک ترین بنیاد اور سہارا ہے یا یوں کہیئے کہ منبع ہے اور ایک چیز ہے جو کبھی نہ پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی اسکی موت ہے اور اس میں وقت و جگہ کی پابندی نہیں ہے۔ "میں" "انا" چونکہ لطیف سے لطیف ترین چیز ہے اور اس سے زیادہ لطیف ترین ہستی ہونا کے ساتھ نہایت نزدیکی ہے۔ اسلئے "میں" لطیف سے لطیف ترین چیز اور بڑی سے بڑی چیز کا زیادہ اخذ ہے۔ چونکہ لطیف سے لطیف ترین چیز ہستی لازوال ہے جو اس سے بڑی چیز "میں" کی بنیاد اور باعث تخلیق ہے۔

یہاں پر یہ بتادینا ضروری ہے کہ جس طرح پانی کو اگر ۲۱۲ درجہ کی حرارت

پھر اڑایا جائے تو یہ پانی ایک کثیف چیز بھی ایک لطیف تیز بھاپ کی صورت بن جاتا ہے اور
بھاپ کی ایک انفرادیت حاصل ہوتی ہے جس میں پانی کے نزدیک ترین خاصیتیں
بھی شامل ہیں۔ اسی طرح نظام کلی کے تحت بھاپ جو کہ پانی کی شکل و صورت سے
بہت مختلف ہے پیدا ہوئی ہے۔ اسی طرح ذرہ خاک نے بھی نظام کلی کے تحت ایک
"میں" کہنے والی چیز کی حقیقت حاصل کر لی ہے۔ جس کو ہم روح کے نام سے بتلاتے ہیں
اسی وجہ روح عام عناصر کے مجموعہ کا نام روح دیا گیا ہے۔ گویا اور کوئی چیز نہیں بلکہ ایک
ذرہ خاک کا معراج نزدیکی لازوال ہستی ہے۔ جو کہ جملہ موجودات کے عناصر کی
تاثیرات لے کر ایک مرکب بن گیا ہے اور یہ مرکب جملہ عناصر لطیف و کثیف کی تاثیرات
و لطیف قواء لے کر "انا" کی تعریف میں آیا ہے۔ اور جسم انسانی میں انفرادیت کا وجود حاصل
کر کے بذات خود آگاہی مالک بن گیا ہے۔ ریشم کا کیڑا اپنے ہی مصالحہ سے اپنا گھر بناتا ہے۔
جس وقت ہمارا ذہن کل کائنات کی طرف رجوع ہوتا۔ تو اس وقت خاک کا
پیدا ہونا ایک آخری نتیجہ حرکت ابتدائی کا معلوم ہوتا ہے چونکہ اس خاک کی پیدائش
حرکت ابتدائی سے ہے اس بڑی چیز لازوال ہستی سے ظہور میں آئی ہے۔ لیکن جس
وقت ہمارا ذہن انسانی وجود انفرادی کی طرف جاتا ہے۔ تو اس وقت سے اول
خاک اور دیگر عناصر کی ترکیب ظہور کی سے ہستی لازوال کا ہونا قائم ہوتا ہے۔ گویا
کائنات کے وجود کی ابتداء "ہونے" سے شروع ہو کر خاک کے عنصر کے پیدا ہونے
پر ختم ہوتی ہے۔ اور یہ خاک کا ذرہ اس منزل کو ختم کر کے واپس بذریعہ جسم انسانی جون کی
سے پیدا ہوا ہے اپنے اصلی مرکز تخلیق ہستی لازوال کو حاصل کرتا ہے۔ یعنی وہ اپنے
گھر جہاں سے اس نے سفر انفرادیت شروع کی تھی اور اس جہان کے مختلف مدارج سے

گذار کر اور بحیثیت انسان جملہ حواس خمسہ خواہش و عقل کے عناصر کی خوشی سے مطمئن نہ ہو کر

اور یہ تجربہ حاصل کر کے کہ ۔

سکون دل کا میسّر گُل و ثمر میں نہیں!

مزہ جو آشیاں میں ہے وہ باغ بھر میں نہیں

واپس اپنے گھر کل ہستی لازوال کو حاصل کرتا ہے ۔ حواس خمسہ کی جاذبیت سے جو

خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ناپائیدار ہے مطلب وہ لا انتہا خوشی و سکون و اطمنان

حاصل کرنا ہے جو لازوال ہے ۔ یہ خوشی حاصل نہیں ہو سکتی ہے ۔ جبتک نہ ہستی لا

زوال میں انسان اپنی ہستی کو مدغم نہ کرے ۔ جو کہ حقیقی فرض اشرف المخلوقات انسان

ہے ۔ دراصل جملہ ذرات کی پیدائیش اس لازوال ہستی سے ہوئی ہے ۔ اس میں ایک

ذرے کی انتہاہ طاقت کے اظہار سے اس لازوال ہستی سے تبدیلی حاصل ہوتی اور

یہ طاقت رفتہ رفتہ عنصر خاک تک ختم ہوتی ہے ۔ اب یہ ذرۂ خاک واپس طاقت

حاصل کر کے انسان کا جسم پاکر "میں" کی صورت میں ہستی لازوال میں جو کہ لا انتہا

طاقت و خوشی کا سرچشمہ ہے ملنا چاہتا ہے ۔ ؎

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا

سفر خاکی شبستان سے نہ کر سکتا اگر دانہ "اقبال"

یہ خواہش انسان کو ازل سے شعوری یا لاشعوری طور پر موجود ہے ۔ یہ وہ خواہش نہیں ہے

جو ہم اس لفظ کے معنی سمجھتے ہیں ۔ بلکہ یہ خواہش بدل کر خود آگہی ہے گویا جو لا انتہا طاقت و

لا انتہا خوشی حاصل کرنے کی خواہش ہے وہ خود آگہی ہے جس کے حاصل کرنے سے انسان کا مقصد

و منشاء ہستی حاصل کرنیکا فرض انسانیت پورا ہوتا ہے لیکن انسان اپنی ساری قوت کم درجہ کی خوشی حاصل کرنے میں

صرف کرتا ہے جو خوشی ابدی نہیں ہے

یہ بات اب واضح طور ثابت ہے کہ کوئی چیز ہماری زندگی یا ہماری موت میں موجود ہے جو کبھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن موجود ہے۔ جب وہ چیز کسی اور چیز سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ تو اُس چیز کی موت بھی نہیں ہے۔ گویا وہ تغیر پذیر نہیں۔ ازل سے ابد تک ایک ہی حالت میں موجود ہے۔ جن چیزوں میں وجود و فنا کے تعلق سے کوئی حدود مقرر ہو چکے ہیں۔ ایسی چیزوں سے وہ مبرّا و منزہ ہے اور بالکل اثر پذیر نہیں ہے۔ لہٰذا اُس چیز میں جس میں موت و پیدائیش کا سوال نہیں ہے۔ تبدیلی کی زد میں نہیں ہے اور وہ چیز ہونا ہتی ہے۔ جسکا علم ہونا خود آگہی ہے۔ گویا بالوں بالوں میں بے اختیاری سے یا شعوری طرز پر ماتما۔ اللہ۔ بھگوان کی ایک صفت کا تصور ذہن میں ایک معمولی طریقہ سے حقیقی طور آجاتا ہے۔ جس طرح اللہ۔ بھگوان کی صرف ایک صفت کا علم بہ ہوش و حواس خمسہ انسان کے ذہن میں آئیگا تو دیگر حقیقی صفات خدا سے منسوب کئے جائیں۔ اُن کا ہونا بعید از قیاس عقل انسانی نہیں ہوگا۔ اسلئے خدا کی ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے جو ہے اور حقیقت سے ذہن میں لایا جا سکتا ہے نہ کہ صرف اعتقاد سے جس میں دل زیادہ اور عقل کم کام کرتی ہے۔ دل کی راہبری ہوتی ہے لیکن عقل راہبری کرتی ہے۔ اِتنا ہی فرق ہو کر بھی اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جب ایک چیز کی صفت واضح طور ذہن میں تسلیم کی گئی ہو تو دیگر صفتیں بھی موجود ہونی لازمی ہیں۔ یعنی جو چیز موت و پیدائیش سے بری ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہر وقت موجود ہے جس میں تفاوت جگہ و وقت نہیں ہے چونکہ تفاوت وقت و جگہ تبدیلی کی وجہ ہے۔ ایسی چیز کسی اور چیز پر ٹھہری نہیں ہے۔ جس چیز میں ایسی صفتیں پائی جاتی ہیں۔ تو اُس میں ایک طاقت ہے ایک قوت ہے جو کبھی ختم نہ ہونیوالی چیز دکھائی

دیتی ہے۔ اِسلئے جو صفات یا قوت، اُس چیز میں ہیں وہ برابر لازوال ہیں۔ جس طرح آفتاب لاکھوں سالوں سے روشنی و گرمی دیتا ہے کبھی نہ ختم ہونیوالی چیز دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ لاکھوں سالوں سے زندگی بخش تاثرات دے کر بھی بدستور قایئم ہے اسی طرح ہونا بھی ختم نہ ہونیوالی شے ہے۔ البتہ آفتاب اور ہستی میں فرق ہے۔ کہ ہم آفتاب کو کسی بڑی شے پر قایئم ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ اِسلئے کسی اور چیز سے پیدا ہوا ہے اور کسی چیز پر ٹھہرا ہوا ہے۔ اِس وجہ سے پیدا ہوئی چیزوں میں شامل ہے۔ جس سے ثابت ہے کہ آفتاب بھی کبھی ختم ہو سکتا ہے۔ بقول غالب۔ ؎

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار باد یہاں

لیکن "ہونا" پیدا ہوئی چیزوں میں شامل نہیں ہے۔ اِسلئے یہ کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتا ہے۔ چونکہ بے نیاز پیدائش و فنا ہے اِسلئے اِس چیز میں ایک لازوال قوت بھی ہے اور جو صفتیں اس سے منسوب کی جایئں وہ لاانتہا اور لازوال ہیں۔ اس میں کمی و بیشی کا سوال نہیں ہے۔ ایک ہستی مکمل ہے۔ ایک لازوال ہستی کے لئے ایک لازوال قوت کا خیال ذہن میں قدرتی آجاتا ہے۔

قوت

طاقت کے ساتھ طاقت رکھنے والی شے کا خیال ذہن میں لازمی طور پر آتا ہے۔ اگر ہم تواریخ پر ایک سرسری نظر ڈالینگے یہ بات واضح ہوگی کہ دُنیا میں جتنے طاقتور انسان

پیدا ہوئے ہیں۔ اُن تمام آدمیوں کا مقصد ایسا سکون والیسی مُسرت اور ایسی خوشی حاصل کرنا تھا۔ جو عام آدمی حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ گویا اُنہوں نے طاقت کا استعمال ایک غیر معمولی خوشی حاصل کرنے کے لئے ہی کیا ہے۔ چونکہ جسقدر افعال و اعمال اُن سے سرزد ہوئے ہیں محض ایک خوشی حاصل کرنے کے لئے ہی ہوئے ہیں اور خاص اپنے ذاتی نفس کے لیے۔ اگرچہ اُن کے افعال و اعمال کا ردعمل تخریب یا تعمیر کے نتائج لے کر ظاہر ہوا۔ اگر انسان میں تھوڑی سی بھی طاقت نہ ہو تو وہ بے جان و مفلس ہے اور مفلسی کے ساتھ ساتھ عام رنج و غم و احساس کمی لاحق ہوتے ہیں۔ جہاں ہم طاقت دیکھتے ہیں۔ وہاں پر بھی نظر آتا ہے کہ اُس طاقت کے استعمال کرنے والے کا مقصد ایک خوشی حاصل کرنا ہے۔ گویا انسان جو کچھ اپنے افعال و اعمال و احساسات کی طاقت سے نتائج حاصل کرتا ہے وہ ابتداء میں یعنی اُن افعال اور اعمال کرنے سے پہلے اپنے آپ کو اطمینان و خوشی حاصل کرنے کے لئے ہی کرتا ہے۔ ایک انسان کی زندگی کا ہر لحظہ اس تگ و دو میں صرف ہوتا ہے کہ اسکو خوشی حاصل ہو۔ وہ کھاتا ہے۔ پیتا ہے۔ کام کرتا ہے۔ کسی کو تکلیف دیتا ہے کسی کو خوش کرتا ہے۔ کسی کو امداد دیتا ہے۔ ہر کاروبار زندگی جو کرتا ہے شعوری یا لاشعوری طور پر ایک ابتدائی مقصد کے لئے کہ وہ صرف اپنے ذاتی نفس کو خوشی بہم کرنے کے لئے کرتا ہے اور اپنے جسم کے تمام قواء سے حتے المقدور کوشش کرتا ہے۔ وہ رنج و غم بھی اُٹھاتا ہے تو اس مقصد کے لئے ؎

غم دیا ہے کہ مُسرت دی ہے
سب میں اک طرح کی لذت دی ہے

یہی مقصد تمام ذی حیات مخلوق کا ہے۔ اور خاص کر اشرف المخلوقات انسان کی زندگی کا نصب العین یہی ہے۔ جس کے لئے وہ اپنے جسم کے تمام ذرائع سے اپنی طاقت کا استعمال کرتا ہے۔

اگرچہ اس کو اس حقیقت کا شعوری طور علم نہ بھی ہو کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ اور ایک مشین کی طرح لاشعوری طور کام کرتا ہے۔ اگر مشین کے ہونے کا مقصد بھی تلاش کرینگے تو اس سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ مشین بنانے والے نے خوشی حاصل کرنے کے لئے مشین بنائی ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ زندگی کا اظہار عملی طاقت ہے جسکا مقصد منتہٰے خوشی حاصل کرنا ہے۔ اور حصول اطمنان و مُسرت کی کوشش لامتناہی سلسلہ ہیں ہے کیونکہ مکمل خوشی حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اور جب تک پوری خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ انسان ہمیشہ اس مکمل خوشی حاصل کرنے کی تلاش میں رہیگا اور اسکی تلاش میں شعوری یا لا شعوری طور بدستور رہیگا۔

عام آدمی اور ایک عظیم شخصیت کے مالک کے فعل و عمل میں ظاہری طور کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ہی ان کے ہر فعل و عمل کے حقیقی مقصد خوشی حاصل کرنے میں ہے۔ البتہ عام آدمی جو فعل و عمل کرتا ہے وہ ایک عبادت کے زیر اثر آکر کرتا رہتا ہے اور ایک معیار خوشی حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ لیکن ایک عظیم شخصیت کا مالک اس سے وسیع تر خوشی حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ چونکہ وہ شعوری طور پر مقصد مُنتہٰے حاصل کرنا چاہتا ہے اس میں خود آگہی کی بڑی طاقت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی عظیم شخصیتوں نے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد اور دوسروں کو خوشی دینے کے لئے قربانیاں دی ہیں۔ برعکس اس کے عام انسان کے ذہن میں وہ شعوری بیداری نہیں ہے۔ عظیم شخصیت کا مالک ظاہری طور جو افعال کرتا ہے اور جن ذرائع سے وہ انجام دیتا ہے۔ ایک عام انسان کے افعال اور ذرائع سے مختلف نہیں ہے۔ عام انسان کے فعل و عمل میں محدودیت اور خود غرضی کا عنصر زیادہ شامل ہے۔ چونکہ وہ خود آگاہ شعوری طور نہیں ہے۔ عظیم شخصیتوں کو

جن کو انسان کے راہبروں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اُن میں بہت سارے ایسے ہیں جنکی سوانح حیات میں اس بات کا تذکرہ نہیں ہے۔ کہ اُن کے فعل و عمل میں ایک خاص طریقہ یا پروگرام مثلاً ورزش۔ یوگ۔ حبس نفس۔ چلہ کشی مخصوص علالت تمام عمر کرتے رہے ہیں جن کے بغیر وہ عظیم شخصیتوں کی تعریف میں نہیں آسکتے۔ اگر کہیں کہیں اسکا ذکر بھی آیا ہے لیکن اس بارے میں ان چیزوں کو کوئی اہمیت اُن کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے نہیں دی گئی ہے۔ چونکہ ایسی پابندشیں ایک خود آگاہ کے ساتھ نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی زندگی کے ساتھ ان چیزوں کا ہونا ایک عام انسان کے طریقہ زندگی کے بسر ہونے کے واقعات وحالات ہیں، جو عام انسان کے حالات اور واقعات سے کوئی مختلف یا عجیب نہیں رہے ہیں۔ لیکن اُن کی عظمت کے ساتھ ایک طاقت وابستہ رہی ہے وہ خود آگہی کی طاقت جو اُن کے ذہنی شعور میں حد درجہ بیدار تھی یعنی اُن میں ایسی قوت تھی جو عام آدمیوں میں نہیں تھی جس قوت نے اُن کو اپنے اعلےٰ مقام پر پہنچایا۔

ہم جو افعال کرتے ہیں وہ صرف اپنے ذاتی نفس کو خوشی دینے کے لئے ہی کرتے ہیں

ہم دیکھتے ہیں کہ کئی ایسے افعال و اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ جو کسی اور کو باعث تکلیف ہوتے ہیں یا خود فاعل کو بعد میں تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ پھر ہر ایک فعل میں یہ خوشی کا پہلو کہاں سے آ گیا ہے۔ ہمارے جملہ افعال حرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ حرکت کے ساتھ ایک قوت کام میں لائی جاتی ہے اور جہاں قوت کا خیال آتا ہے تو اسکے ساتھ ہمیشہ خوشی ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو رنج و تکلیف اُن کے افعال سے ہوتا ہے وہ بعد کا اثر ہے۔ مگر ابتداء میں حرکت کرنے کا راز اپنے ذاتی نفس کو خوشی دینا ہے۔ ہماری زندگی نہ رہ جاتی اگر ہم افعال نہ کرتے۔ یہ ابتدائی حرکت پورا کرنے کا کام

ہے جو اسکو خوشی دیتا ہے۔ اسکے بعد کا اثر کیا ہوگا وہ مفروضہ ہے۔ جس قدر حرکت موجودات عالم میں ہے صرف اُس "انا" کی ابتدائی خواہش پورا کرنے کی غرض سے حرکت میں آئی ہے اور رنج و غم جس کا ہمیں بعد میں احساس ہوتا ہے اصل مقصد حصول لا انتہا خوشی میں اثر انداز نہیں ہیں۔ اصل چیز وہی ہے جس کے لئے ہماری زندگی کا عمل ہے اور لاشعوری طور پر وہ اطمنان نفس خود حاصل کرتا ہے۔ اس خود آگہی کے ساتھ ایک قوت بھی کام کرتی ہے۔ جو کوئی دوسری چیز نہیں بلکہ اصل مقصد کے ساتھ منسلک ہے۔ چونکہ جسقدر کاروبار کائینات میں ہے یہ صرف طاقت کا کرشمہ ہے۔ جبکا اصل مقصد لا زوال ہستی کے ہونے کا ہے اور وہ ہے لا انتہا مسرت و شادمانی و اطمنان کُلی ہے گویا اظہار طاقت اور خوشی ایک ہی چیز ہے۔ رنج و غم اسوقت پیدا ہوتے ہیں جبوقت افعال و اعمال کے نتایئج میں ہم آہنگی و تسلسل ہستی کے اصل مقصد لا انتہا مسرت و سکون کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں جب افعال واعمال کے نتایئج میں نیکی نہ ہو تو جن افعال و اعمال سے بُرے نتایئج پیدا ہوں اُن میں محدودیت ہے۔ اسیلئے ایسے افعال و اعمال کو اس کائینات کے لامحدودیت اور مقصد لا انتہا مسرت کے ساتھ مطابقت نہیں ہے۔ اس وجہ سے افعال بد کے ساتھ نتایئج رنج و غم ساتھ ہیں۔ رنج و غم دراصل ایک نیک کام کے نہ ہونے کا نتیجہ ہیں اور ایک علاج ہے اُس چیز کی جس کی درستی مطلوب ہے۔ جہاں درستی کی ضرورت نہیں ہے وہاں رنج و غم نہیں ہیں۔ چونکہ لامحدودیت صرف ایک لا انتہا خوشی و مسرت اور محدودیت رنج و غم کے ساتھ وابستہ ہے جو کہ افعال و اعمال بد کا نتیجہ ہے۔ گویا افعال بد کے نتایئج تغیر پذیر ہیں لیکن نیک افعال کے نتایئج تغیر پذیر نہیں ہیں بلکہ انسان کی طاقت کو اور

وسعت مل جاتی ہے جو اسکو لامحدودیت حاصل کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہے

جو ملک یا قوم طاقتور ہے اس ملک یا قوم میں امن زیادہ ہے۔ برعکس اسکے جو ملک یا قوم کمزور ہے اس میں تکلیف وحیرانی و پریشانی زیادہ ہے اسوجہ سے جو انسان زیادہ سے زیادہ اطمنان والا اور امن پسند ہے وہ دیگر انسانوں سے جو حیران و پریشان ہیں زیادہ طاقت والا ہے۔ حیرانی و پریشانی کمزوری کی علامت ہے۔ جہاں پر بے انتہا قوت ہے وہاں پر بے انتہا آرام و آسائش ہے۔ یہ کمزوری وحیرانی و پریشانی ایک لابدی چیز ہے۔ جہاں زندگی کسی اور چیز سے پیدا ہوئی ہے۔ اسوجہ سے موت کی زد میں ہے۔ اسلئے جو چیز موت کی زد میں ہے وہ لا انتہا خوشی حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ جس چیز میں موت و پیدائش نہیں ہے وہی چیز لا انتہا خوشی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ چیز "انا" ہے جس علم خود آگہی ہے جس میں لا انتہا قوت ہے۔ یہی ایک راز ہے کہ دنیا میں جو صاحب علم ذات پیدا ہوئے ہیں۔ وہ تمام انسانوں سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ اسی لئے وہ اور انسانوں سے زیادہ خوش رہے۔

اگر کوئی شخص کسی ایسے فقیر کامل یا برگزیدہ شخص کے پاس جاکر اپنے آپ کو بھول جائے اور ایک عجیب خوشی اور اطمنان حاصل کرے جتنی دیر وہ اس کے سامنے ہے۔ تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فقیر کامل یا برگزیدہ شخص واقف علم ذات ہوکر ایک بڑی طاقت کا حامل ہے جس شخص کے متعلق کہا گیا ہے سے۔

اس مرد خود آگاہ و خدا دوست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز!

ایسے ہی طاقتور لوگوں سے ایک عام انسان اُن کے ارشادات تسلیم کرتا ہے جو انسان کو زیادہ

سے زیادہ خوشی و اطمینان قلب حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ چونکہ انسان کے مشکلات حل ہو کر یعنی وہ ایک قوت حاصل کر کے رنج و غم و کمی پر قادر ہو کر خوشی حاصل کرتا ہے۔ جہاں طاقت ہے وہاں خوشی ہے۔ گویا طاقت اور خوشی ہم معنی و مقصد ہیں۔ یہی ایک وجہ ہے کہ انسان قدرتی طور علم خود آگاہی کی طرف کسی نہ کسی وقت رجوع ہوتا ہے۔ چونکہ خود آگاہی ایک چیز ہے جس میں ایک اتھاہ طاقت ہے۔ ایسے صاحب علم ذات نے مُردوں کو زندہ کیا ہے۔ وہ جادوگر نہیں تھے اور نہ ہی کسی خاص عمل کے ذریعہ وہ تماشہ اور اظہار طاقت خود کرتے رہے۔ چونکہ ان معجزات کے اظہار کے لئے کوئی عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح ایک جادوگر کو ایک خاص عمل کرنے سے ایک مخصوص طاقت حاصل ہوتی ہے جب وہ شعبدہ بازی کے کمالات دکھاتا ہے۔ صاحب علم ذات کسی معجزہ کے اظہار کے لئے عنصر خواہش کا مرہونِ منت نہیں رہتا ہے۔ جہاں پر ایک صاحب علم ذات کوئی کرشمہ کرتا ہے یا جو اوروں کو ایک کرشمہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ کل طاقت کے ایک حقیر ذرے کا اظہار ہے۔ ممکن ہے کہ جس کا علم خود صاحب علم ذات کو بھی نہیں ہوگا کہ اُس سے کوئی کرشمہ ہوا ہے۔ چونکہ صاحب علم ذات خواہش کے عنصر کا گرفتار نہیں ہوتا ہے اور بدون رضائے تنظیم کُلی کے وہ کچھ نہیں کرتا ہے۔ اس صورت میں وہ لاشعوری طور بے عمل ہوتے ہیں اور جو مظاہرات و معجزات اُن سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ کائیناتی نظام کے تحت ہوتے ہیں جس کے اظہار میں وہ بے لگاؤ ہوتے ہیں۔ اگر وہ معجزات کے ساتھ بے لگاؤ نہیں ہوتے تو اُن کو قوت علم خود آگہی حاصل کرنے کے لئے (جو وہ اپنے دیگر کرشمہ جات میں استعمال کرتے ہیں) وقت و قوت نہیں رہتے ہیں۔ چونکہ علم خود آگہی حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص عمل یا فعل کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ زندگی کے روزمرہ کام میں بلا کسی مخصوص عمل کے حاصل ہو سکتی ہے

ہر ایک چیز جو ہمارے خیال میں آتی ہے ۔ ایک لطیف احساس زندگی لے کر سب چیزوں
میں قایم ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ گویا ہماری نظر میں جو چیز ہے وہ اپنے وجود اور اپنی ہستی کا ثبوت
دیتی ہے اور زبان حال میں کہتی دکھائی دیتی ہے کہ میں ہوں ۔ اگر اپنے کمرے میں رکھی ہوئی
چیزوں کو ذرا غور سے دیکھیں تو ہر چیز یہ کہتی دکھائی دیتی ہے کہ میں ہوں اور میرا کام یہ ہے۔
اور اپنے اپنے ہونے کے ساتھ مستعد ہے اور زندہ ہے ۔ ریڈیو ۔ کرسی ۔ میز ۔ کتابیں ۔ بجلی کا
لمپ ۔ قلم دوات ۔ پوشاک ۔ کمرے کی چھت ۔ کھڑکیاں ۔ در و دیوار یں جملہ بہ زبان بے زبانی
کہہ رہی ہیں کہ ہم حاضر ہیں ۔ ان تمام چیزوں میں بلا لحاظ اُن کی جسامت ۔ رنگت ۔ نام ۔ وزن ۔
چھوٹا پن اور بڑائی کے ایک ہونا ہی سب چیزوں میں ہے ۔ اور ان کے ہونے سے ایک
مقصد پورا ہوتا ہے اور پورا کر رہے ہیں ۔ وہ مقصد اظہار خوشی ہے ۔ کمرے کے باہر دیکھیں تو
درخت ۔ میدان ۔ مکانات ۔ آسمان ۔ بادل اور جملہ قدرتی نظارے یہی کہتے دکھائی دیتے
ہیں کہ ہم ہیں اور دیکھنے والے کو کوئی احساس دیتے ہیں "ہونے" کی جس میں ایک اطمنان
ہے ایک خوشی ہے ۔ اگر ان تمام چیزوں سے ظاہری شکل و صورت خارج کرینگے تو ایک
ہی چیز باقی رہتی ہے جس میں یہ سب چیزیں بکھری پڑی ہیں وہ ایک "ہونا" ہستی ہے ۔
جس کے قریب ترین ایک وسعت ہے ۔ اس ہونے میں ایک مقصد زندگی ہے ۔ اگر ان چیزوں
میں زندگی نہ ہوتی جو ایک "ہونے" نے ان کو دی ہے اور دیکھنے والے میں زندگی نہ ہوتی تو
بھی ان چیزوں کو کالعدم ہونا تسلیم کر سکتے ہیں ۔ اور اگر انسان میں یہ ہونا نہ ہوتا اور
خود آگہی نہ ہوتی تو وہ بھی ان چیزوں میں شمار کیا جاتا جن کو وہ دیکھتا ہے اور اپنے
ہونے کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کا ہونا بھی تسلیم کرتا ہے ۔ احساس زندگی انسان نے ان
چیزوں سے لیا ہے ۔ چونکہ وہ خود زندہ ہے ۔ اگر انسان میں خود آگہی نہ ہوتی تو وہ زندہ نہ ہوتا

اور جن چیزوں کو وہ دیکھتا ہے وہ بھی اسکو زندگی نہ دیتے۔ گویا انسان بھی اپنے ہونے کے ساتھ ان چیزوں کو اپنا ہونا دیتا ہے۔ جو ہیں اور نابود نہیں ہیں۔ اسلئے جو چیز ہے اُس میں زندگی ہے۔ اور ہونا ہی ایک جزو ناقابل تقسیم تمام اشیائے موجودات ہے جو مکمل ہے اور موجود ہے۔ چونکہ موجودات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں ہونا نہیں ہے۔ یہ احساس زندگی صرف انسان ہی محسوس کرتا ہے۔ چونکہ وہ خود آگاہ ہے۔ اوپر دی ہوئی کمرے کی مثال میں جتنی چیزیں کمرے میں ہیں اُن کا بنانے والا انسان ہے جس نے یہ چیزیں بنا کر اپنے ذاتی نفس کو خوشی دی ہے۔ ترکھان۔ بافندہ۔ معمار۔ لوہار۔ انجینئر۔ مصنف۔ سائینس دان وغیرہ نے یہ چیزیں بنائی ہیں کہ وہ ایک طاقت حاصل کرے یا دوسرے لفظوں میں ایک خوشی حاصل کرے جن کے ذریعہ وہ اور چیزیں جنکی اسکو خوشی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ خوشی ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کے لئے ضروریات زندگی حاصل کرے۔ اسلئے جو کام انسان کرتا ہے محض ایک مقصد کو لے کر کرتا ہے اور وہ مقصد خوشی حاصل کرنا ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ جملہ اشیا جو کائینات میں ہیں اس کا موجود ہونا ہی ایک خوشی کا راز ہے۔ اسلئے تمام ہستی" ہونے" کا مقصد ایک خوشی ہے۔ گویا ہونا اور خوشی ایک چیز ہے چونکہ خوشی صرف طاقت کے استعمال سے ہوتی ہے۔ اگر ہم اس خوشی کے پہلو اور وجود کو ترک کرینگے تو اسکے ساتھ طاقت کو بھی ختم کرنا۔ طاقت کو ختم کر کے ہر ایک فعل کو بھی اور فعل کو ختم کر کے حرکت کو بھی ختم کرنا ہے۔ مگر ے

"سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں"

اور یہ بات روز مرہ کے مشاہدہ سے بھی اور آج کل کے سائینس نے بھی ثابت کیا ہے کہ ہر ذرہ حرکت میں ہے اور ہر ذرے میں حرکت ہے۔ اسلئے ناممکنات میں ہے کہ خوشی کا پہلو ترک

کر سکتے ہیں۔ چونکہ سکون۔ لاشعور میں بھی حرکت کا پہلو حاوی ہے اور ہماری ہستی حرکت دوام ہے چونکہ جس چیز سے ہم پیدا ہوئے ہیں۔ سکون مردہ نہیں ہے۔ بلکہ زندہ ہے چونکہ سکون کو سمجھنے والا اور کہنے والا زندہ ہے مردہ نہیں ہے۔ اسلئے ؎

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

یہی کوشش ناتمام حرکت دوام ہے۔ یہی اظہار طاقت اور یہی ابدی خوشی ہے۔ جس عنصر کو انسان خود آگاہی سے کبھی ترک نہیں کر سکتا ہے۔ بلکہ ؎

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

ذات ابدی کا انسان کے ذہن میں قائم ہونے سے۔ اسکے صفات بھی ذہن میں آنا قدرتی ہے۔ کسی چیز کی اگر ایک ہی صفت مکمل طور پر ہمارے ذہن میں آئیگی تو اُس کی دیگر صفات سمجھنے میں ایک طرح کی آسانی ہو سکتی ہے۔ ہستی الطیف کے ابدی ہونے سے اسکا محیط کل ہونا جو خود مرکز بھی ہے۔ ہر جگہ موجود ہونا۔ ہر ایک چیز سے وابستہ ہونا وغیرہ ہمچو قسم صفات اِس ہستی کل کے ساتھ ناقابل ترک اور لازمی ہیں۔ انسان جو کچھ متحرک و ساکن چیزیں ذہن میں لاتا ہے۔ سارے اس ہونے میں ہیں۔ تمام افعال و اعمال جو کہ موجودات کل کائینات میں ہیں اس واحد ذات ابدی کے ساتھ ہیں اور جسقدر طاقت اس کرشمہ کائینات میں ہے۔ اس کی واحد صفت ہے اور دیگر۔ اوصاف اس ذات واحد کے متعلق انسان کے ذہن میں جو آتے ہیں۔ تمام اُس ہونے میں ہیں بلکہ جسقدر خیالات جو ماضی میں آئے اور آتے رہینگے اور

آتے رہتے ہیں تمام کے تمام اس ہستی اللطیف میں موجود ہیں۔ ایسے صفات اس ذات واحد کے ساتھ وابستہ ہو کر ذہن میں آنے سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس ہستی و اللطیف میں ایک لا انتہا قوت ہے۔ چونکہ اس قوت کا مظاہرہ ہر شے میں پایا جاتا ہے یعنی جس چیز میں ہونے کی قوت ہستی نہیں ہے وہ موجود نہیں ہے۔ انسان ہی ایک ایسی چیز کا حامل ہے۔ جس میں وہ طاقت ہے جو اور کسی چیز میں نہیں ہے جس سے وہ سوچ سکتا ہے اور سوچ سمجھ کے بعد کام کر سکتا ہے۔ جو دیگر ذی حیات میں نہیں ہے۔ اور وہ ہے حصہ خود آگہی کل آگہی کا۔ آفتاب ہماری نظروں میں ایک تابندہ گول چیز ہے اور اس میں اُن کُل ذرات کا ہونا تصور میں لانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کئی ایک ذرات کا مجموعہ ہے اور ہر ایک ذرہ بحیثیت خود روشن ہے۔ اگر ایک ذرہ ایک نقطہ کی مانند ہی کیوں نہ ہو۔ چونکہ نقطہ سے کم تر کوئی چیز ذہن میں نہیں آسکتی ہے۔ اس ذرے میں حصہ تابندگی و طاقت ہے۔ اسی طرح انسان میں جقدر حصۂ علم کُل ذات واحد ہے اُسی قدر اُس حصہ طاقت میں مکمل آزادی و تبدیلی لانے کا بھی حصہ ہے۔

فانی تیرے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں۔

جو نظام کلی کی پابندی کے ساتھ ساتھ وہ اس ذرے کی طاقت بھی اُس قدرت سے استعمال میں لا سکتا ہے جو کل ذرات سے وابستہ ہے۔ یہی مقصد انسان کے تمام افعال اور زندہ رہنے کا ہے کہ وہ اس حصۂ طاقت کو کل ہستی کے قوت کے ساتھ مدغم کرے۔ جو انسان میں بقدر ایک ذرہ کے موجود ہونا پایا جاتا ہے اور انسان میں اُسی قدر

ایک بے نیازی ہے جو وہ اپنے حصہ طاقت کو کل کے ساتھ اتصال بذریعہ کوشش انفرادی اور ذاتی سے کرے۔ اور وہ کب حاصل کر سکتا ہے۔ جب وہ اپنی ذات کو جس کو ہم نے انسان میں عام دیگر عناصر سے بہت بڑی چیز قرار دیا ہے۔ اور وہ ایسا کرنے میں اسوقت کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب وہ اس ذات کے چھوٹے درجہ کے عناصر سے لگاؤ سے ذہنی طور بے لگاؤ و بے نیاز ہو کر اپنے ذریعہ استغنائیت کی قدرت سے چھوٹے چیزوں سے چھٹکارہ حاصل کرے۔

موجودہ سائینس نے اس بات کو بخوبی تجربہ سے ثابت کیا ہے۔ کہ اگر ایک ذرے کا موجودہ نظام جس کے تحت یہ اسوقت ظاہر ہے ختم کیا جائے تو اس ذرے کی ایک اتھاہ طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک ذرے کے اُس انتظام کو جس سے اس ذرے کی محدودیت حاصل ہوئی ہے۔ وہ محدودیت ختم کی جائیگی تو وہ اُس کل ہستی کے ہونے میں مدغم ہوگا۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ تمام مجموعہ ذرات ایک طاقت کا مجسمہ ہیں۔ جس میں لاکھوں ذرے کی انفرادی طاقت شامل ہے۔ اور وہ طاقت محض ذرے کے وجود میں ہونے کی ہے۔ نظام کلی کی پابندی کے ساتھ ساتھ علم حیات موجودہ سے بھی ثابت ہوا ہے۔ کہ ایک ناقابل تقسیم ذی حیات جسم Cell خود بخود اپنے سے ہی دوسری ہو بہو Cell بناتا ہے۔ اور اس طرح سے ذی حیات موجودات کی خاص ترکیب کے تحت لائے جانے سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ Cell کی طاقت ہے جو اس کو اپنے ہونے سے حاصل ہوئی ہے اور اپنی جیسی ہو بہو Cell بناتا ہے۔ اس طرح دیگر موجودات مجموعہ ذرات بن کر ایک مختلف چیز کی شکل و شباہت حاصل کر کے رہ گئی ہے۔ یہ اس طاقت کے اظہار کا ایک نتیجہ ہے جس سے ایک خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔ اِس قیاس سے یہ

حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ ایک ذرہ ٹھوس تشکل سب سے پہلے پیدا ہوا ہے۔ جس کی اپنی قوت ہستی سے دیگر مجموعہ ذرات کا وجود حاصل کر کے جو بعد میں موجودہ تشکل وصورت اشیائے موجودہ کی اختیار ہو چکی ہے۔ اور جسم انسانی میں اخیری لطیف ترین چیز بن کر خود آگاہی ہستی کی قوت سے بشکل "انا" ہو کر قایم ہوئی ہے۔

قوت سے مطلب وہ چیز ہے۔ جس کو تبدیلی کرنے کی قابلیت ہے۔
ایک پتھر ہے جس میں تبدیلی پیدا کرنے کی قابلیت نہیں ہے۔ اس لئے اس میں طاقت کی کمی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک چیز اس پتھر میں ہے وہ اسکا ہونا ہے۔ یہی طاقت ہے جس کی وجہ سے اس پتھر کا ہونا ظاہر ہوا ہے۔ انسان میں تبدیلی کرنے کی قوت بمقابلہ دیگر موجوداتِ عالم کافی ہے۔ اور وہ انسان کے "انا" میں ہے۔ چونکہ اس "انا" کو ایک لاانتہا طاقت کے ساتھ نزدیکی اور وابستگی ہے۔ جس کا اظہار انسان کے رگ وریشہ اور افعال و اعمال سے بخوبی ہوتا ہے۔ گویا جس قدر انسان کے پاس مدارج ترقی سے حاصل ہوتی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اس قوت کو وہ بڑھا سکتا ہے۔ اور اس قوت کو اس حد تک بڑھا سکتا ہے اور جس کے بڑھائے جانے کی تلقین اسکو ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہیگی جس حد تک وہ کل قوت لاانتہا کا ایک جزو ہو کر بھی اپنی تمام تر ہستی کل سے مدغم کرے۔ چونکہ خود آگاہی کے ہونے میں تبدیلی کرنے کی قابلیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجوداتِ عالم معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ اسلئے اس خود آگہی میں محدودیت نہیں ہے۔ بلکہ اس ہونے میں وہ قوت تبدیلی بھی ساتھ ساتھ ہے۔ اظہار قوت بھی اور قوت کا اظہار بھی۔ جس طرح ایک انسان کو قوت ہو کر بھی بلا حس وحرکت رہ سکتا ہے لیکن جب تک نہ وہ انسان اس قوت کا مظاہرہ کرے وہ زندہ تصور نہیں ہوسکتا ہے

ہستی کُل ایک بلا طاقت شے نہیں ہے اور نہ ہی مردہ ہے۔ بلکہ زندہ ہے اور زندگی کا اظہار قوت ہے اور اظہار قوت ہی "ہوتا" ہے۔ اور قوت کا کام ہے تبدیلی پیدا کرنے کی قابلیت ہے۔ اسی وجہ سے یہ موجودات عالم صرف ہونے کی قوت کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔ گویا ہونے میں جو طاقت و قوت ہے۔ اس کا کرشمہ نیرنگ عالم ہے۔ اس طاقت کے ساتھ خوشی ہے۔ اسلئے اظہار طاقت اور احساس خوشی ایک ہی چیز ہے۔ مقصد اظہار مقصد خوشی ہے اور یہ دونوں چیزیں "ہونے" میں ہیں۔ یعنی ہونا ہی خوشی ہے۔ انسان میں جسقدر اس ہونے کا احساس ہے۔ اُسی قدر وہ خوشی کا حاصل ہے اور جتنا یہ احساس کم ہے اُتنا ہی وہ اسکے حاصل کرنے میں سرگرداں ہے اور مجبور عمل ہے۔ اِس ہونے کے ساتھ ہونے کا احساس ہے۔ ایک consciousness کا تشخص ہے جوکہ اس ہونے کی زندگی ہے۔ یہ طاقت اس ہونے میں اسی وجہ ہے۔ چونکہ اس چیز کو موت و پیدائش سے آزاد پایا ہے جس چیز میں موت نہیں ہے وہ اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اُس چیز میں اسی قدر طاقت ہے جس درجہ تک وہ موت و پیدائش کی زد میں آسکتی ہے۔ لیکن جس چیز میں موت پیدائش نہیں ہے۔ اس میں ایک لا انتہا طاقت کا ہونا لازمی ہے۔ گویا ہر ایک چیز جو پیدا ہوئی ہے وہ ختم بھی ہوگی تو اُس چیز کا پیدا ہونا اور ختم ہونا بھی ایک طاقت کے بغیر نہیں ہے طاقت کا احساس اس میں ساتھ ہے۔ اور اتنا باریک اور لطیف ہے کہ طاقت اور احساس ہستی ایک ہی چیز دکھائی دیتی ہے اور جب ہم طاقت کا احساس رکھتے ہیں تو اسکے ساتھ ایک خوشی و اطمینان خودی کا احساس ہے۔ چونکہ ہر ایک حرکت کا اثر کسی چیز کا اطمینان لئے ہونا ضروری ہے۔ گویا جو نتیجہ طاقت کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے سب سے پہلے وہ مرضی و مسرت خودی کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہونا ہستی و قوت اور خوشی ہے ان تین چیزوں میں وقت اور وسعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ان تینوں چیزوں کا ایک مرکب بنایا جائے تو یہ مشکل ہوگا کہ اس مرکب کو ان تینوں چیزوں میں کس چیز کا نام دینگے۔ چونکہ ان تینوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ یہ مرکب یا تو ایک ہستی ہی ہے یا قوت ہے یا خوشی ہے۔ ایک چیز دوسرے دو چیزوں کی صفت ہے اور جس چیز کو ہم صفت کہتے ہیں وہ چیز ہی اصل ہے۔ اور باقی دو چیزیں اسکی صفت ہیں۔ ان تینوں چیزوں میں اول ہونا ہے جو کہ پیدائیش و موت سے آزاد ہے۔ اسکی نسبت خوشی اور قوت کو ہم نے اُس طریقہ سے ذہن میں لائے جانے کی کوشش نہیں کی جس طریقہ سے ہم نے پہلے بیان میں "ہونے" کو ہی موت و پیدائیش سے بری ہونا ثابت کیا ہے۔ حقیقت میں اگر ایک مثلث مساوی الاضلاع کا صرف ایک ہی طرف معلوم ہو جائے تو اُسکا مطلب ہے کہ اسکے دو اور اطراف اس مثلث کے معلوم ہو جائینگے۔ اس طرح اگر ایک صفت ہی کسی حقیقت کا عقل سے حاصل کیا جائے تو جسقدر دیگر معاملات اُس چیز کے ہونگے وہ بھی ذہن میں ساتھ ساتھ آئینگے جسوقت مرکز خیال اُن کی طرف لگ جائیگا۔" ہونے میں ایک ابدی خوشی ہے جو کہ آخیر مقصد تمام ہستی کا ہے۔ خوشی تب تک حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ جب تک نہ طاقت حاصل ہوگی اور طاقت کا حاصل کرنا تب ہی ممکن ہے جب تک نہ اسکے منبع سے حاصل ہوگی اور وہ ہستی کل کی طاقت ہے۔ جو انسان کے علم خود آگہی حاصل کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ انسان کو جتنی طاقت کی ضرورت ہے اُتنا ہی اُسکا ذہن لطیف سے لطیف تر ہونا ضروری ہے۔ اس وجہ سے انسان کو طاقت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور اس وقت وہ روحانیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہی ایک وجہ ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ جو مذکورہ تین چیزوں کا ایک نام ہے۔ علم و دانش یوگ

سمادھی ۔ ذکر و فکر حصول سدھی اس طاقت کو حاصل کرنے کے لئے استعمال میں آتے ہیں کثیف عناصر کی امداد سے اتنی طاقت ہم کو حاصل نہیں ہوتی ہے جتنی احساسات لطیف سے ہمیں حاصل ہوتی ہے ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے ۔ کہ یہ بار ۔ یہ مجبوری یعنی خدا خدا کرنا بھگوان ۔ اللہ تعلےٰ وغیرہ ہمچو قسم اسمائے الٰہی انسان کو کیوں برداشت کرنے پڑتے ہیں ۔ کیا ان ناموں کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا ہے ۔ اور جو مفروضہ توہمات جیسے ان ناموں کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں ۔ ہمارے ذہن سے دور نہیں کئے جا سکتے ہیں ۔ کیا ان ناموں کے بدلے اور جو یہ نام اظہار کرتے ہیں اور کوئی چیز ذہن انسان میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ ان ناموں سے جو تاثرات ہمارے ذہن میں پیدا ہوئے کیا ان کے بغیر ہم خواہشات و کاروبار زندگی پورے نہیں کر سکتے ہیں ؟ ۔ اس اللہ تعلےٰ اور بھگوان کی کیا ضرورت ہے جسکو اگر دیکھا بھی ہے تو شکل انسانی میں اگر نہیں دیکھا ہے تو ایک صورت موہوم میں ایک تصویر خیالی کی صورت کبھی نور اور کبھی افضل صفات کا گمان کرکے یہ کیا ایک مرض ہے جس میں انسان عرصہ دراز سے مبتلائے وہم خدا و بھگوان ہے ۔ ان ناموں کو بھلا دینے سے اور ان ناموں کے ساتھ جو احساسات ہیں کیا اُن سے نجات ملنے کے ساتھ تمام کاروبار جہاں ختم ہو سکتا ہے ۔ کیا روحانیت کے بغیر انسان فرشتہ ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتا ہے ۔ اور جو ایجادات انسان نے دنیا میں لائے ہیں ۔ کیا وہ خدا کے نام کی رٹ لگا کر ہی وجود میں لائے گئے ہیں ۔ اگر انسان ان خیالات خدا و بھگوان کو اپنے ذہن سے خارج کرے اور ان خیالات کو واہیات تسلیم کرکے اپنے ذہن کو اس سے صاف کرے ۔ تو کیا ہو گا ۔ خدا کو بھول کر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے چونکہ ہماری زندگی ایک نظام کلی کے تحت کام کر رہی ہے ۔ اسلیے اگر خدا کی ہستی کو ذہن سے دور کیا جائے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑیگا ۔

کیا انسان ختم ہو گا؟ نہیں کچھ نہیں ہو گا۔ اسلئے اگر ہم خدا کی ہستی سے منحرف ہو جائیں پھر بھی کاروبار کائینات جاری رہیگا۔ اسلئے کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم خدا کو اپنے ذہن میں رکھنے کے بجائے۔ اس کے نام اور تاثرات کی طرف ذاتی توجہ نہ دیں۔ جس طرح سے اسوقت ایک رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ اور خدا اور بھگوان کا ذکر کرنے والا بھی دقیانوسی خیالات کا آدمی تصور کیا جاتا ہے اور جدید پسند طرز تمدن رکھنے والے کے تضحیک کا نشانہ بن جاتا ہے جیسا کہ اکبر الہ آبادی نے کہا ہے ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر خدا کا نام لیتا ہے اس زمانے میں

پہلے کہی باتوں سے یہ واضح طور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ ہماری زندگی کی تمام تگ و دو ایک خوشی حاصل کرنے کے لئے وقف ہو چکی ہے اور یہی اعلےٰ مقصد انسانیت ہے اور انسان یہ خوشی اپنے عمل و فعل سے حاصل کرنا چاہتا ہے اور وہ تب ہی حاصل کر سکتا ہے۔ جب وہ ارد گرد کے ماحول پر اپنی انفرادی حیثیت سے تاثیر و تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ دنیا میں ایک بڑا آدمی وہ ہے جو دوسرے ہم جنسوں پر کسی نہ کسی طریقہ حاوی ہو جائے اور ان میں تبدیلی پیدا کرے اور ایک بڑا آدمی ہونے کی حیثیت میں اس میں ایک برتر قوت ہوتی ہے۔ جو دوسروں پر اثر انداز ہو سکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس میں جسمانی اور مادی قوتوں کا ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ ایک اور چیز ہے جسمیں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے اور وہ ہے تخیل ـ

تخیل ایک لطیف چیز حواس خمسہ سے ہے۔ جب تک انسان کے تخیل میں وہ

طاقت نہ ہوگی وہ دوسروں پر اثر انداز نہیں ہو سکتا ہے۔ چونکہ ہر فعل انسانی حواس خمسہ کے عمل کی بنیاد و وجہ حرکت خیال ہے۔ ہماری زندگی میں ہر ایک فعل و عمل سے ایک مجموعی قوت پیدا ہوتی ہے اور جب وہ قوت جو ہماری کوششوں کے اظہار کا نتیجہ ہے۔ تو وہ قوت بھی زیر اثر دیگر اشیاء اگر اُس طریقہ سے ہمیشہ قایئم نہیں رہتی ہے۔ جس طریقہ سے وہ انسان کے فعل و عمل کی ابتدائی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس طرح یہ طاقت ایک باریک شے ہے۔

ہماری زندگی جو ہر فعل و عمل کا نتیجہ ہے ایک مجموعی قوت پیدا کرتی ہے۔ اور اس مجموعہ قوت کو حاصل کرنے کے لئے ایک مشق مکرر کی ضرورت رہتی ہے۔ جو کہ ہماری روزمرہ زندگی کے واقعات سے بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔ ہم روز بیٹھتے ہیں اُٹھتے ہیں کھاتے ہیں چلتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ سوتے ہیں جاگتے ہیں گویا ہماری تمام عمر لاتعداد افعال و حرکات کا مجموعہ ہے جس کو بار بار دھرایا جاتا ہے اور خاص کر جس وقت تک ہمارے جسم میں طاقت ہے۔ جس سے ہماری زندگی بن جاتی ہے۔ اگر ہم کھانے کے فعل کو سات دن ترک کرینگے یا سنید کو۔ تو ہماری جسمانی حالت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ہماری زندگی ایک مسلسل اور مکرر داستان ہے ہر فعل و عمل کی جس سے ہمارے زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے اور کئی سال تک ایک مجموعہ قوت بنی رہتی ہے اور آہستہ آہستہ پھر زائل ہونے لگتی ہے۔ اگر ہمارا دل حرکت اولیس کو نہیں دھرائیگا تو ہم کہاں زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ دھراؤ کس قدر اور کیا ضروری ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجائیش نہیں ہے۔ ایک بجلی کا ڈائنمو لاکھوں چکر نہیں کاٹیگا تو بجلی کی روشنی نہیں مل سکتی ہے۔ اس ڈائنمو کی زندگی یہ دھراؤ ہے۔ کرۂ خاک گردش میں۔ سیارگان پھر

وہی رفتار کرتے آئے ہیں۔ گویا مشق مکرر کر رہے ہیں۔ جس سے اس کائینات کی زندگی قایم ہے۔ اگر یہ دھراؤ کا چکر نہیں ہوتا تو شاید زندگی بھی نہ ہوتی اور نہ یہ کائینات۔ ایک بت تراش اگر ضربات کے فعل کو نہیں دھرائیگا اور پتھر پر مسلسل ضربات بہ پابندی نظام نہ لگائے تو کہاں ایک بت کا مجسمہ بن سکتا ہے۔ اگر قلم کی رفتار مسلسل نہ ہوتی تو صفحہ قرطاس پر عبارت تحریر نہ ہوتی۔ اس مشق مکرر میں ایک استقامت ہے ایک تسلسل ہے۔ ایک ہم آہنگی ہے۔ جس سے ایک قوت کی زنجیر بن جاتی ہے۔ جس کے ہر ایک فعل مکرر ایک ایک کڑی کی صورت ہو کر ایک مجموعہ قوت کی زنجیر بن جاتی ہے جس میں سارا نظام جکڑا ہوا ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ ہر ایک فعل مکرر کو قوت کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ اگر چہ ہر ایک فعل کا اظہار ایک مقصد لیکر ہی کیا جاتا ہے۔ اگر دودھ کو ایک خاص حرکت مکرر نہ دی جائے تو مکھن حاصل ہونا محال ہے۔ اس سے اشارہ مل سکتا ہے کہ ایک فعل کو اسکے نتیجہ کے ساتھ ایک رشتہ ہے ایک لگاؤ ہے۔ حالانکہ فعل اور اسکے نتیجہ کو آپس میں ظاہری طور دور کا رشتہ نہیں دکھائی دیتا۔ یہ ایک طاقت کے اظہار کا کرشمہ ہے۔ ہر ایک حرکت مکمل ہے اور مکمل ہونا اس صورت میں ہے جس صورت میں حرکت ابتدائی واپس حرکت انتہا میں قایم ہوگی۔ وہ حرکت مکمل نہیں ہے جو ابتداء کو انتہاء کے ساتھ مدغم نہ کرے۔ اس لئے دایئرے کی شکل مکمل ہے۔ اگر اجرام فلکی ایک دایئرہ کی شکل حرکت نہ کرتے تو اُن کی حرکت مکمل نہ ہوتی اور کوئی طاقت پیدا نہیں ہوتی اس طریقہ سے جس طریقہ سے اسکا اظہار اور نتیجہ پیدا ہو رہا ہے۔ یہاں عمل کا مطلب ہے کسی فعل کا بار بار کرنے سے ایک باریک تفاوت وجگہ دو فعلوں میں لازمی ہے اور یہی تفاوت اخیر پر کسی فعل کے بار بار کرنے سے ایک نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ جس کی بنیاد محض ایک طاقت ہے۔ اگر اس فعل میں طاقت نہ ہوتی تو کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوتا۔ اس مشق مکرر کا نام عادت ہے۔

اعادہ کسی چیز کا کرنا۔ عادت کا لفظی معنی اگر سمجھا جائے تو مکرر کرنا کسی چیز کا پہلے ارادے سے اور بعد میں بلا ارادہ۔ اس وجہ سے ہر ایک نتیجہ کے حاصل کرنے کے لئے اعادہ کی ضرورت قدرتی طور لاحق ہوتی ہے۔ چونکہ قوت کا تصور ایک نزاکت خیال کے بغیر صحیح طور نہیں ہو سکتا ہے اسکی ایک مثال سے جو کہ واقعات کی بناء پر سو فیصدی درست ہے اشارہ کیا جاتا ہے۔

ایک برگیڈر فوج کئی خاص عمل و فعل کرنے کے بعد اس عہدہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جس وقت وہ اس عہدہ پر مامور ہے تمام سہولیات۔ عزت۔ رتبہ۔ قدرت حکم دہی۔ حصول تابعداری۔ دوسرے اشخاص سے وغیرہ طاقت کا حامل ہوتا ہے۔ جو غیر معمولی قابلیت پیدا کرنے کے بعد اسکو حاصل ہوتی ہے یہی برگیڈر فوج ریٹائر ہوتا ہے۔ تو تمام مذکورہ سہولیات وغیرہ طاقت زائل ہوتی ہے۔ اگرچہ اسکے دماغ۔ عقل اور قابلیت احکامِ دہی۔ طرز تحریر وغیرہ ساری چیزیں قایم ہیں اور اُن میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی اسکو ریٹائر ہونے کے بعد کوئی آدمی آنکھ اُٹھا کر اسکی طرف نہیں دیکھتا ہے۔ جب وہ ملازم تھا اور جہاں جہاں سے وہ گذرتا تھا عام آدمی بھی اسکا آداب بجالاتے تھے۔ اور کئی آدمی اسکی تابعداری میں حلقہ بگوش تھے۔ وہ کیا چیز تھی جو اسکو اپنے عہدہ کے وقت تھی اور اب ریٹائر ہونے سے گم ہوئی حالانکہ اسکے دماغی قابلیت اور حواس خمسہ و دل اس کے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی بدستور قایم اور بلا زوال موجود رہے۔ جسوقت یہ تضاد دماغ میں پیدا ہو اُس وقت ایک روحانیت کا طلوع ہوتا ہے۔ چونکہ مادیات کی بنیاد لطیف چیزوں پر مبنی ہے۔ جہاں لطیف ترین چیزوں کی طرف ذہن لگ جائے تو روحانیت کا ایک قدرتی میلان انسان کی طبیعت میں ذہن کی سطح پر آجاتا ہے جیسا پہلی ذکر کیا گیا۔ کہ انسان کو ازل سے اگرچہ لاشعوری طور سے ہی ہے لا انتہا طاقت و خوشی حاصل کرنے کی تڑپ موجود ہے۔ اور اور جہاں زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کا خیال

انسان کے ذہن میں آئیگا تو قدرتی طور انسانی ذہن اس منبع طاقت کی طرف راغب ہوتا ہے
چونکہ ہر ایک چیز اپنے اصل کی طرف فطرتاً عود کرتا ہے۔

"کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلیٰ اَصْلِہٖ"

اور انسان اس منبع طاقت کو جس کو خدا۔ بھگوان وغیرہ کا نام دیا ہے قدرتی طور اس کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔ ایک خدا سے منحرف ناستک کو بھی حصول طاقت کے لئے سرچشمہ قوت ابدی کی طرف لاشعوری طور رجوع ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ حصول طاقت کی خواہش بنی نوع انسان کی سرشت میں مرکوز ہے۔ اور جسقدر عملیات تمام مذاہب میں ہیں اسی غرض کے حاصل کرنے کے لئے معرض وجود میں آئی ہیں کہ انسان کو تمام چیزیں جنکی اسکو خواہش نے ضرورت پیدا کی ہے باآسانی حاصل کرے۔ اس وجہ سے انسان نے خدا کی عبادت اور ہر طریقہ پرستش قبول کیا۔ کہ اسکو ایسی طاقت حاصل ہو جو دوسروں سے زیادہ ہو۔ اور یہ تمام اعمال اُس ذخیرہ قوت سے حاصل کرنے کے لئے ہی کئے جاتے ہیں۔ اسی وجہ خدا۔ بھگوان کا نام اسی منبع طاقت کو دیا جانا ضروری ہے۔ چونکہ ان ناموں کے ساتھ ایک اتھاہ طاقت وخوشی، کے خیالات سے وابستہ کیا گیا ہے۔

ہر مذہب میں ایک لازوال ہستی کا ہونا تسلیم کیا گیا ہے اور اسکے حصول کے لئے قواعد وضوابط مخصوص شرعی پابندیاں عرصہ دراز سے اپنے اپنے مخصوص طریقہ سے بتدریج ترقی پاکر آخری شکل میں معرض وجود میں آئی ہیں۔ جن کے مجموعہ کا نام مذہب دیا گیا ہے۔ دراصل ایک ذرہ کے معراج ترقی میں مختلف ماحول اور کیمیائی تراکیب سے گذر کر اپنے اصل کی قربت حاصل کرنے کے لئے جب سے اس کو اپنے حقیقی منبع سے دوری پیدا ہوئی ہے۔ اسوقت سے ایک انفرادیت یعنی علیحدگی از کل کا احساس پیدا ہوا

اسوجہ سے اپنے گل میں واپس جانے کے لئے مخصوص جگہ۔ آب وہوا۔ رنگت۔ نسل۔ قومیت و مذہب منتخب کر کے جسم انسانی میں ظاہر ہوا۔ چونکہ اس جسم میں وہ اپنے منبع کو اپنی خود آگہی سے نزدیک پایا ہے۔ اور جس جسم انسانی کو حاصل کر کے اپنے مقصد منتہے لا انتہا مسرت وقوت جہاں سے وہ آیا ہے اُس میں واصل ہونے کی کوشش کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے اس لئے اس ذرے نے ایک مخصوص مذہب میں جسم انسانی میں آنا قبول کیا ہے۔ جو اسکے دوران تجربہ اور حصول انفرادی رجحان طبع کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ ؎

ہر کہ باشد در جہان مشتاق ہم رنگ خود است

کاہ در پرواز مے آید چو بیند کہسرُبا

چونکہ جس وقت اس ذرہ کو اپنے منبع کی طرف جانے کا بوجہ کمی کے احساس ہوا۔ اُس وقت سے اسکا سفر واپس بطرف اصل خود کے شروع ہوا اور جو مقصد منتہے یا نام منبع اُس مذہب میں قرار پایا ہے۔ اس ذرے کو جسم انسانی میں تسلیم کرنا پڑا۔ چونکہ اُس جسم انسانی کے تمام لوازمات کو پوری پابندی جہاں سے وہ پیدا ہوا ہے لاحق ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ نام خدا۔ بھگوان وغیرہ انسانی جسم کے ساتھ ناقابل ترک ہیں۔ جسم ایک مخصوص مقام ہے ایک مخصوص بھاری سائنسی مشین ہے اس ذرے کا ہے جہاں وہ خود آگہی کے ذریعہ منزل کو پرواز کر سکتا ہے۔ چونکہ اس مقام یا بھاری مشین کے بغیر وہ اور کسی عام جگہ یا عام مشین سے پرواز حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ اسلئے بطریق معمول لاشعوری طور پھر بھی روح انسان اپنے نام و جسم اور مذہب کو نہیں چھوڑتا ہے۔ پھر بھی اس خیال میں کوئی استثناء بھی پایا جائے۔ تو اس امر کے مسلمہ ہونیکی تائید و تصدیق ہوتی ہے جب تک نہ کسی قانون یا اصول میں کوئی استثناء کی گنجائش ہوگی وہ قانون یا اصول مکمل نہیں ہے۔

چونکہ "خوبصورتی میں کوئی نقص نہ ہونا بھی بذاتِ خود ایک نقص ہے"۔ مذکورہ بالا بیان سے اس امر کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ کہ انسان میں اگر لا انتہا مسرت و طاقت حاصل کرنے کی خواہش نہ ہوتی تو خدا کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ اور نہ ہی وہ احساسات جو اس قسم کے ناموں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اِس سے ثابت ہے۔ کہ ہر ذی روح انسان میں اگرچہ لا شعوری طور ہی ہے۔ ایک خواہش لا انتہا قوت و مسرت حاصل کرنے کی موجود ہے۔ جس انسان میں یہ خواہش ذہن میں شعوری طور نہیں ہے وہ ایک عدم درجہ کا انسان ہے۔

رُوحانیت

رُوحانیت سے مطلب غربت اور مفلسی نہیں ہے۔ بلکہ ان چیزوں کے دُور کئے جانے کا ایک ذریعہ ہے رُوحانیت علم خود آگہی ہے۔ جو سب سے بڑی چیز ہے جس کی بنیاد ہستی کل پر ہے۔ یہی ایک سب سے بڑی چیز موجودات عالم میں قایم ہے اور بالکل بہ طریق معمول عام فہمی سے اِسکا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انسان کو تمام سہولیات و احساسات خوشی جو اِسکو حواس خمسہ کی بدولت حاصل ہو سکتی حاصل کرنی لازمی ہیں چونکہ وہ فطرتاً مجبور ہے لیکن اُسی حد تک جس حد تک وہ انسان کے اصلی مقصد زندگی کے نصب العین کے حاصل کرنے میں سدِ راہ نہ بن جائیں۔ ترقی طرز تمدن روحانیت سے دستبرداری نہیں ہے۔ موجودہ دور میں جبکہ ایک کوشش ہے۔ کہ عام آدمی کو وہ تمام خوشیاں میسر ہوں جو اسکو حواس خمسہ کے استعمال سے حاصل ہو سکتی ہوں بہم کی جانی

ضروری ہیں۔ تو انسان کو روحانیت کی طرف لے جانا حصول مادیات سے انحراف کئے جانے کی تلقین نہیں ہے۔ بلکہ یہ تمام چیزیں حاصل ہو کر بھی انسان کو علم ذات سے مستفید ہو کر لا انتہا خوشی حاصل کرنے کی ترغیب دیا جانا ضروری ہے۔ چونکہ روحانیت ہی اسکو مادی اشیاء سے غیر معمولی خوشی حاصل کر کے اپنے درجہ انسانیت اور اشرف المخلوقات کے درجہ سے گراوٹ سے بچانے کے لئے ہی ایک واحد ذریعہ ہے۔ چونکہ جس قوم یا ملک میں جس شخص میں خوشی حاصل شدہ از مادیات روحانیت کی طرف نہ لے جائے۔ تو وہ اپنے اصلی مقصد انسانیت سے گرجاتا ہے اور انسانیت کے لئے گنہگار ثابت ہوگا۔ روحانیت انسان کے لئے ایک ورثہ عظیم ہے اگر وہ اس ورثہ سے محروم رہیگا تو حیوانیت کے عنصر سے مغلوب ہو کر جملہ انسانیت کے لئے ایذا رساں ثابت ہوگا۔ اہل مغرب نے مادی اشیاء سے خوشی حاصل کر کے روحانیت کو پس پشت ڈال کر جملہ انسانیت کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا ہے۔ اور ایسے ایجادات عمل میں لائے۔ جس سے انسان کو رنج و غم میں مبتلا ہونا پڑا ہے۔ آئے دن جرائم و افعال بد ان ممالک میں بڑھتے ہی رہتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے حقیقی فرض انسانیت سے بے بہرہ ہوتا جاتا ہے چونکہ مادی اشیاء کی ترقی سے حاصل شدہ خوشی پر ہی اکتفا کیا ہے۔ حالانکہ انسان لا انتہا خوشی حاصل کرنے کی پوری صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن چھوٹی خوشی حاصل کرنے پر قانع ہونا انسان کی طاقت جو پائی لا انتہا خوشی حاصل کرنے کی قوت کو زائل کرتی ہے اور انسان اصلی مقصد حاصل کرنے سے رہ جاتا ہے جو کہ فرض اولین کی انجام دہی میں کوتاہی برتنے کے مترادف ہے۔

قوت کیا چیز ہے اسکا انحصار کسی شخص کی قابلیت ظاہری اور نا قابلیت پر

نہیں ہے۔ اوپر دی گئی مثال میں برگیڈر وہی شخص ہے لیکن کیا چیز تھی جو اسکو ایک عرصہ کے لئے ایک غیر معمولی طاقت کا مالک بنا دیا تھا اور ریٹائر ہونے کے بعد وہ طاقت زائل ہوگئی۔ یہی نزاکت قوت کی ہے جو مادی اشیاء سے ثابت نہیں ہوسکتی ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ ایک روحانیت کا تقاضہ ہے۔ اس طرح موجودہ دورِ حکومت میں کئی ایسے بے علم منسٹران۔ ممبران اسمبلی اس درجہ تک پہنچ گئے جو اداروں کے قضا و قدر کے مالک بنے۔ وہ کیا چیز ہے جو ان کے پاس کچھ عرصہ رہی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اُن سے چلی گئی۔ چونکہ اس نزاکت کی وضاحت عام منطق سے حل نہیں ہوسکتی ہے۔ اسی وجہ سے عرصہ قدیم سے اِس نزاکت طاقت کی جانب بنی نوع انسان نے ایک منبع قوت تلاش کیا ہے۔ جس کو خدا بھگوان وغیرہ ناموں سے منسوب کیا گیا ہے۔ جو عقل سے باہر ہے اور بے نیاز عقل ہوکر عقل کا مالک بھی ہے۔

پہلے بتایا گیا ہے۔ کہ انسان کی روح ایک ذرے کے مدارج ترقی اور کیمیائی تراکیب سے وجود میں آئی ہے اور جسم انسانی میں کئی ایک تبدیلیوں کے نتیجہ کے طور پر ظہور میں آئی ہے۔ اور اُن مدارج ترقی میں کوئی ایسے عمل و فعل اپنی قوت انفرادی کی وجہ سے صادر ہوئے ہیں۔ جن میں استغنائیت اور آزادی شامل ہے اور ایسی انفرادی قوت و آزادی کو عام نظام کلی میں کچھ وقفہ کے لئے استعمال میں لایا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ایک نادان شخص بھی کسی وقت اس طاقت کا رکھنے والا بن جاتا ہے جس کو دیکھ کر کئی دانا لوگ حیران اور بے بس ہوکر رہ جاتے ہیں ؎

نا اہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت

ہے خوار زمانے میں کبھی جوہر ذاتی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اُس ذرہ طاقت میں جو آزادی عمل ہے کسی وقت کے لئے اسکو استعمال کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے اور روحانیت اُس ذرہ طاقت کا استعمال کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس ذریعہ سے وہ کُل ہونے کی طاقت اور خوشی کے ساتھ مدغم ہو سکتا ہے۔ اس ذرے کی منزل جہاں سے یہ ذرہ وجود میں آیا ہے اور اسکا وجود محض "ہونے" سے حاصل ہوا ہے۔ اور اس منزل کی واپس جانے کی راہ پر اِس ذرے کو کسی وقت اپنے ہونے کا علم کچھ وقفہ کے لئے رہتا ہے اور وہی بیج بن کر نظام کلی میں خاص وقت پر ایک طاقت کا اظہار کرتا ہے۔ چونکہ ہماری زندگی راستہ ہے آخری منزل پر پہنچ جانے کی۔ اس وجہ سے ایک نادان اور نااہل بھی کسی وقت کچھ عرصہ کے لئے اِس طاقت کا اظہار کرتا ہے جہاں کئی عالم و فاضل و دانا لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہ ؎

دادِ او را قابلیت شرط نیست

بلکہ شرط قابلیت دادِ اوست

تمام ہونے میں جو طاقت ہے اس میں ہر ایک ذرے کو اپنا حصہ طاقت موجود ہے جو کہ وہ کبھی بذریعہ خود آگاہی استعمال میں لا سکتا ہے۔ یہ آزادی ایک ذرے کو ہے کہ نظام کلی میں پابند ہو کر بھی کسی وقت پر اپنے فطری استغناء سے نظام کلی میں حاصل کر سکتا ہے جس کو عام طور پر فضل ربی سے بھی منسوب کیا جاتا ہے ؎

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

ان خیالات سے یہ عیاں ہے۔ کہ قوت ایک لطیف ترین چیز ہے اور وہ قوت

دس ہونے نہیں ہے جبکا عقل سے جو مادیات اور اسکے باریک احساسات میں ٹھوس طریقہ سے تجربہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جہاں عقل بے بس ہے وہاں روحانیت کا وجود ہے اور اس میں فکر اور وجہ کے ذریعہ پہنچ جانا انسانی دماغ کے لئے مشکل ہے۔ اسلئے روحانیت کی ہستی کا قایئل ہونا پڑتا ہے۔ خدا کا خیال صدیوں سے انسان کے ذہن میں بطور ورثہ مرکوز ہوا ہے۔ خدا کی ہستی روحانیت سے ہی وجود میں آئی ہے نہ کہ مادیات سے۔ جہاں مادیات کا غلبہ ہے۔ وہاں روحانیت خارج از بحث ہے۔ اسلئے خدا کی ہستی اور روحانیت ایک ابدی چیز ہے۔ تواریخ اس بات کی آئینہ دار ہے۔ کہ دنیا میں جتنے صاحب مادیات پیدا ہوئے ہیں۔ غلبہ مادیات کی وجہ سے وہ روحانیت سے دستبردار ہوکر ہمیشہ انسان کے لئے ایذا رسانی کا باعث ہوئے ہیں اور آخیر پر انکو روحانی قوت کے آگے سرتسلیم خم کرنا پڑا ہے۔ اس ضمن میں راون۔ فرعون ور دمن ظالمان جن میں مادیات و حیوانیت کا غلبہ رہا ہے تمثیلاً پیش کئے جاتے ہیں۔

جہاں طاقت و قوت کا احساس آتا ہے۔ تو انسان کے ذہن میں لا انتہا قوت کا خیال لازمی ہے۔ اگرچہ لا انتہا طاقت کو خدا و بھگوان وغیرہ کے نام بھی نہ دئے جائیں۔ چونکہ بغیر حصول طاقت زندگی نہیں ہے۔ زندگی ایک وقفہ ہے بابت حصول طاقت اور وہ طاقت جس سے انسان کی "انا" اپنے اصل میں مدغم ہو۔ اور یہ طاقت مادی اشیاء سے زیادہ سے زیادہ حاصل نہیں ہوسکتی ہے بلکہ اس سے زیادہ باریک اور لطیف ترین چیز سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ جہاں باریکی اور لطافت کا خیال ذہن میں آجاتا ہے۔ تو انسان کو روحانیت کی طرف راغب ہونا قدرتی ہے۔ اسلئے کہ انسان کا روحانیت کی طرف رجوع ہونا اس بات کی

دلالت کرتا ہے۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو کہ پہلے ہی اُس کی روح میں لاشعوری طور موجود ہے۔ یہی ایک وجہ ہے۔ کہ انسان مشکلات میں خدا کو ڈھونڈنے لگ جاتا ہے اور پیراں فقیراں اور مردان خدا روحانی آدمیوں کے آستانوں پر چکر کاٹتا رہتا ہے۔ چونکہ وہ اپنی حقیقت اصلی کو بھول جاتے ہیں۔ اسلئے قدیم الایام سے خدا اور بھگوان کا نام ذہن میں جاگزین ہو کر انسان کے شعور سے خارج نہیں کیا جاسکتا ہے۔ البتہ جو غلبہ مادیات کی وجہ سے عام انسان کے لئے پس پردہ ہونا پایا جاتا ہے۔ اور کسی نہ کسی وقت جب انسان کو احساس خود آگہی کی جانب خیال آتا ہے تو اُس کی جانب تلاش روحانیت اپنے اندر سے بھی شروع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام کُلی کے تحت انسان کسی نہ کسی وقت مجبور احساسات لا انتہا قوت و مسرت پانے کا خواہاں ہے اور جتنا جلدی وہ ان کے حاصل کرنے کی طرف مائل ہوگا یا روحانیت کو اپناتا ہے اور بہ طریق معمول کسی کاروبار زندگی میں خلل ڈالنے کے بغیر اس مقصد کو نصب العین بناتا ہے۔ اتنا جلدی ہی وہ اپنے مقصد کی کامیابی کی راہ پر گامزن ہو کر انسانیت کے معراج پر پہنچ سکتا ہے۔ اور ؎

ہائے سیماب اس کی مجبوری
جس نے کی ہو شباب میں توبہ

ایسے انسان پر لاگو ہوتا ہے۔ جو حواس خمسہ کی شعبدہ بازی اور انکی کشش کی زد میں ابتدائی دور شعوریت زندگی سے ہی نہ آنے کی کوشش کرتا ہے اور روحانیت کا رجحان اپنے طبع بے قرار پر جاری رکھ سکتا ہے۔

اگر ذہن میں تھوڑا سا ٹھہر کر مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات ذہن میں بخوبی

آسکتی ہے۔ کہ اللہ بھگوان وغیرہ ناموں کے ساتھ یکدم تصور لطیف ترین احساس
کی طرف جاتا ہے جو تخیلات مادیات اور ٹھوس چیزوں کی طرف نہیں جاتا ہے۔ بلکہ
اُن کے لطیف ترین احساسات کی جانب۔ یہ لطیف ترین احساسات ہی روحانیت
ہے۔ چونکہ لفظ روح کے ساتھ ہر ایک چیز کی لطافت اور باریکی کا احساس ساتھ ہے
اور خدا۔ بھگوان۔ اللہ کے ناموں کو پیدا کرنے والی شئے روحانیت ہی ہے۔
چونکہ اس روحانیت ہی نے ان احساسات اور ناموں کو جنم دیا ہے۔ روحانیت
میں چونکہ لطافت ہے اور ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جو لطیف سے لطیف ترین چیز اور
بڑی سے بڑی چیز جو موجودات میں ہے وہ ایک "ہونا" ہے۔ ایک ہستی بحث اس
لئے اس روحانیت کی بنیاد بھی اس ہونے میں ہے۔ اس لئے خدا وغیرہ نام قائم ہوئے
ہیں۔ اگرچہ اپنے اپنے درجہ احساسات کی وجہ سے کسی کو بت۔ پتھر۔ مسجد۔ مندر و کعبہ
ذہن میں آجاتے ہیں۔ یہ سارے نام اس ہونے میں ہیں۔ اس ہونے میں لطافت
طاقت اور مسرت و خوشی ہے جو اس روحانیت میں آجاتے ہیں۔ اسلئے جو انسان
روحانیت کی جانب راغب ہوگا وہ ایک قوت حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے
اور وہ چیزیں جو اس روحانیت میں ہیں۔ اس دلیل سے یہ واضح ہے کہ ہم خدا
کو کیوں مانتے ہیں اور روحانیت کیوں وجود میں آئی ہے اور اس کو حاصل کرنے
کے لئے کیوں ہمارے پیغمبران اور اوتاران وغیرہ مردانِ خدا و رشیی وغیرہ تلقین
کرتے رہے۔ یہ خدا کہاں ہے وہ ایک ہونے میں ہے اور ہونا ایک چیز ہے جو غائب
نہیں ہے جبکہ ہمارے ذہن میں یہ ہے کہ خدا ظاہر نہیں ہے اور پس پردہ ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوائے ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا (غالب)

اس کُل کو ذہن میں رکھکر ہم اُس لامحدود طاقت کے روبرو ہو سکتے ہیں جس میں لاانتہا خوشی و مُسرت ہے اور جس کا حاصل کرنا ہی ہماری زندگی کا اصل مقصد ہے۔ چونکہ جس چیز کے سامنے ہم جائینگے اُس کا اثر ہم پر لابدی ہونا ہے۔ ایک مہکتے ہوئے خوشبو سے بھرے ہوئے گلستان میں جانے سے ہمارے دل و دماغ پر خوشبو کا اثر چھا جاتا ہے۔ اسلئے انسان ایک سب سے بڑی چیز کو ذہن میں رکھنے سے انسان کے جملہ حرکات و اعمال و افعال خواہشات پر اس بڑے سے بڑے چیز کا رنگ چڑھ جاتا ہے اور آخیر پر انسان کے ذہن میں اس کا اثر نفوذ ہوتا جائیگا اور انسان کے وجود پر غالب آئیگا اور بقول ؎

"جمال ہم نشین بر من اثر کرد"

کے مصداق انسان کے تگ و دو اور اعلےٰ طرز تمدن میں یہ بنیادی ضرورت و زنگت ساتھ ساتھ ہوگی۔ جس کے نہ ہونے سے خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور اس تاثر کی ضرورت موجودہ طرز زندگی اور طرز تمدن میں پوری ہونی لازمی ہے کہ روحانیت کو تھام کر ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہے تاکہ موجودہ ترقی مادیات کے ساتھ ساتھ ہمارا عزم حصول طاقت و ابدی خوشی میں کوئی نقص نہ آنے پائے۔ اگر یہ ضرورت کم ہوگی تو ہو سکتا ہے۔ کہ ہم بھی اہل مغرب کی طرح انسان کو قعر ذلت میں لے جانے کے گناہِ عظیم کے مرتکب ہونگے اور ملک کی تاریخ میں آگے کسی وقت اولادِ ناخلف شمار ہونگے۔ اگر روحانیت کو جو کہ ہمارے ملک میں صدیوں سے پھلی پھولی ہے۔ نئی پود کے دل و دماغ میں اسکا بیج نہ ڈالیں گے۔ اور نہ ہی موجودہ سائنس و علم سے اسکی تلقین کرینگے بلکہ اس ورثہ کا اُن کو مستحق نہ بنائینگے۔ تو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ جو کہ خصوصی طور ہونی لازمی ہے اور اہل مغرب کی ترقی تمدن میں جو بُرائیاں معرض وجود میں آئی ہیں ہم اپنی

اجتماعی اور معاشرتی زندگی کو اُن کی زد سے بچانے کے لئے کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ چونکہ ہمارے ملک کی تہذیب اسی روحانیت کی بدولت آج تک قایم ہے۔ اور بہمہ وجوہ اس بارے میں کوشش کرنی ہے کہ یہ چراغ جو صدیوں سے روشنی دیتا ہے۔ جدید طرز زندگی کے بادِ مخالف سے محفوظ رہے۔

کرشمہ سازی

روحانیت کے ساتھ کرشمہ سازی کا خیال ذہن میں قدرتی ہے۔ اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ روحانیت کے ساتھ قوت کا ہونا ناگزیر ہے۔ روحانیت وہ طاقت ہے جس سے انسان اپنی ذات کو لامحدودیت کے ساتھ شعوری طور وابستہ کرنے کے لئے استعمال کرسکتا ہے۔ ایسے اشخاص جنہوں نے روحانیت کو اپنایا ہے اور جس کو عام انسان روحانیت سے وابستہ ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ عام لوگوں کے لئے دُنیاوی حل مشکلات و اظہار کرشمہ جات کے لئے ہی روحانیت کو استعمال میں لائے جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ایسی شخصیتوں کو صاحب علم ذات کی تعریف میں لانا تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ روحانیت کی طاقت ماسوائے حصول طاقت ابدی کے استعمال میں لانا اُس طاقت کو ضایع کرنا ہے۔ ایسی شخصیتوں میں وہ سادھو اور فقیر لوگ شامل ہیں جو روحانی کشف و کرامات کرتے ہیں جس سے عام لوگ بلاکسی مقصد ہستی کے متاثر ہوتے ہیں۔ کرشمہ جات کا اظہار اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ کشف و کرامات کرنے والے لامحدودیت و لاانتہا طاقت حاصل کی ہے۔ ایسے کرشمہ جات

اظہار سے لامحدودیت حاصل کرنے میں بڑا اثر پڑتا ہے۔ بلکہ انسان کے ذہن پر ایک خاص قسم کا دباؤ ڈالنا پڑتا ہے۔ کشف و کرامات کے اظہار کے لئے اسکو ایک مخصوص عمل میں اپنے رگ و ریشہ پر ایک خاص قسم کی بناوٹ غیر معمولی طریقہ سے ذہن میں اختیار کرنی پڑتی ہے۔ جو انسان کو ایک انتھاہ طاقت حاصل کرنے میں کسی وقت بھی رکاوٹ کا باعث بن سکتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ایک قوت پیدا کرتا ہے۔ جو اسکے قریبی ماحول پر متضاد اثر پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک آگ پیدا کرتا ہے جو اپنی جگہ کے لئے ایذا رساں ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات مشاہدہ سے بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔ جب ہم کو ایسے کشف و کرامات کرنے والی شخصیت کی ابتدائی زندگی اور انجام کو زیر غور لائینگے۔ جہاں کرشمہ جات کرنے کی خواہش لاحق ہوگی وہ لامحدودیت کے درجہ کے قریب نہیں ہو سکتا ہے۔ ایک کاریگر جو خاص چیز بنانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ تو اُسکو ایک خاص قسم کی قوت اور فراست ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ انسانی جسم لے کر ہی تمام افعال و اعمال کا حامل ہوتا ہے۔ اس ایک خاص چیز کے بنانے کی صلاحیت ہونے سے وہ انسان کے درجہ سے پرے نہیں ہے۔ اس طرح ایک بڑا فنکار اپنی ذہنی طاقت سے اگر اُس نے یہ فن حاصل کیا ہے تو وہ اس مخصوص فن کی طاقت کا استعمال اُس وقت تک ہی کر سکتا ہے۔ جب تک اسکے جسم میں اُس فن کی طاقت زائل نہ ہو۔ کسی جسمانی قوت کا زائل ہونا ایک قدرتی امر ہے اور خاص کر وہ قوت جو حواس خمسہ کے اظہار کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایسے کرشمہ جات اسوقت تک روبہ عمل آتے ہیں۔ جس وقت نظام کلی کے تحت ایسے کرائے جانے کے لئے ایک قسم کا حکم حاصل ہو۔۔۔

جہاں روحانیت کا استعمال کشف و کرامات کے اظہار کے لئے کیا جاتا ہے اس سے

کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں عقل سلیم ہی بتا سکتی ہے۔ کہ ان کی کیا ضرورت اس نظام کلی میں ہے
عام طور پر کشف و کرامات عنصر خواہش سے پیدا ہوتے ہیں اسلئے جہاں خواہش کا عنصر
غالب ہے وہاں عقل سلیم کے حاصل کرنے کے لئے انسان میں ایک کمزوری پیدا ہوتی
ہے۔ اِسلئے کرشمہ جات حواس خمسہ اور کثیف عناصر پہ قدرت حاصل ہو کر بھی انسان
کو ایک چیز حاصل کرنی ہے اور وہ ہے ہستی بحت یعنی "ہونا"۔ اسکا علم ہو کر انسان اشرف
المخلوقات کی تعریف میں آسکتا ہے۔ کرشمہ جات کا اظہار اگر علم خود آگہی کی تعلیم میں ممد
ثابت ہو گا تو اُس صورت میں طاقت کا استعمال ایک مقصد اعلےٰ لے کر ہی کیا جاتا ہے جس
میں لذت نفسانی نہیں ہے لیکن پھر بھی ان کشف و کرامات میں طاقت کی کمی لازمی
ہے۔ جس سے اصل مقصد حصول لا انتہا خوشی پر اثر پڑتا ہے۔ جسم انسان ایک چیز ہے۔
جس میں ہمیشہ زندہ رہنے کی طاقت گھٹتی ہی رہتی ہے۔ جسم انسان کو لامحدودیت حاصل
نہیں ہو سکتی ہے۔ ایک اِنسان لامحدودیت کا درجہ اُسوقت حاصل کریگا جسوقت
انسان کے "انا" میں لامحدودیت حاصل ہوئی ہو گی۔ انسان کے جسم میں لامحدودیت
حاصل کرنے کی قوت نہیں ہے بلکہ اِسکے "انا" میں ہے۔ اس لئے جسم اور جسم کے
"انا" مابین ایک تنہائی ہے انسان کے "انا" میں ایک طاقت ہے جس سے وہ لا انتہا
طاقت کے ساتھ لگاؤ رکھتا ہے۔ اگر اس طاقت "انا" کو اور کاموں میں یعنی کشف
و کرامات میں صرف کیا جائے اور حواس خمسہ کے کھیلوں میں استعمال کیا جائے تو لا انتہا
طاقت کے ساتھ لگاؤ رکھنے میں کمی واقعہ ہو گی۔ اِسلئے اکثر صاحب علم ذات نے اپنے
قریب ترین مریدوں کو کرشمہ سازی میں تضیع وقت و قوت سے احتراز کرنے کی
ہدایت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسوقت بھی کوئی روحانی شخصیت کا مالک اگر کوئی کرشمہ کرے

تو وہ اس قسم کے زیادہ سے زیادہ کرشمہ جات نہیں کر سکتا ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ کرشمہ سازی میں قوت کا استعمال کرنا پڑتا ہے اور وہ قوت پھر جلدی ہی پوری نہیں ہو سکتی ہے۔ چونکہ قوت کے حاصل کرنے میں وقت اور محنت درکار ہے جس کو انسان اپنی عمر میں زیادہ سے زیادہ حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ جبکہ وہ دیگر افعال و اعمال میں صرف کرتا رہتا ہے۔ چونکہ انسان کے "انا" میں نہ کہ جسم کے قواء میں ابدی طاقت حاصل کرنے کی قابلیت ہے اور انسان کا "انا" جسم انسانی چھوڑ کر لا محدود میں مدغم ہو سکتا ہے اور بقول ؎

حریم ذات ہے اُس کا نشیمن ابدی
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہ صفات "اقبالؔ"

اور یہ لا محدودیت صرف ایک ہونے میں ہے۔ جس میں خدا بھی ہے اور خدا کے کرشمہ جات بھی ہیں۔ جس پر ہمارے ذہن کی بنیاد ہے۔ چونکہ ماسوائے اِس "ہونے" کے اور کوئی چیز نہیں ہے جو بلا قید پیدائش و موت ہے۔ ایک عالم ذات میں مستغرق انسان کو فرصت احساس عالم خواہش نہیں ہے جو وہ حواس خمسہ کے کرشمہ جات کرتا پھرے۔ نشاط باغ میں جانے کے لئے کرایہ بھی ادا کیا ہے لیکن درمیان راہ جواہر پارک کی جاذبیتوں میں کھو کر شاید رات ادھر ہی لگ جائے اور پھر واپس جا کر پھر نشاط باغ جانے کے لئے از سر نو پروگرام کرنا ہوگا۔ اِسلئے دانایانِ راز نے آخری منزل پر پہنچ جانے کے لئے کرشمہ جات و کرامات میں وقت و قوت ضائع کرنے سے پرہیز کیا ہے اور ایسے انسان جو نظام کلی کے تحت کرشمہ جات و کرامات کرنے کی قوت حاصل کرتے ہیں۔ محکوم ہیں مالک نہیں ہیں۔ چونکہ وہ بھی ایک ذریعہ کے طور نظام کلی کے اغراض و مقاصد پورا کرنے کے لئے وجود میں آئے ہیں۔

انسان کا اصلی مقام اور مقصد زندگی اس مقام پر پہنچ جانا ہے جہاں پر
اسکو اس چیز کا علم ہو جائے کہ وہ کون چیز ہے جس نے تمام اشیائے موجودات کو اپنے اظہار قوت
کے لئے ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اگر یہ مقصد نہیں ہے تو انسان بھی ایک ذریعہ کے طور استعمال
ہوتا رہیگا۔ جہاں تک انسانی ذہن میں یہ چیز آ سکتی ہے۔ کہ تمام موجودات عالم ایک ذریعہ
اُس لاانتہا خوشی و طاقت کا جس میں ہر ذرہ بطور ایک ذریعہ استعمال میں لایا گیا ہے
تو اُس انسان کو زندگی کا مقصد وہی چیز بن جانا ہے یا اُس چیز میں مدغم ہونا ہے۔
نہ کہ ایک ذریعہ بن کر اُس چیز کے زیر استعمال آئے۔ وہ اس ذریعہ ہونے کی حیثیت
کو ترک کرنا چاہتا ہے۔ یہی آزادی مکمل ہے یہی لاانتہا خوشی ہے اور یہی لاانتہا
طاقت ہے۔ اگر وہ کشف و کرامات کے اظہار کا شائق ہے۔ تو اُس کو یہ منزل دُور
رہتی ہے۔ چونکہ کشف و کرامات کرنے والا جملہ عناصر اور حواس خمسہ کے کرشمہ جات
میں بند رہ کر ہی ایسا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اگرچہ حقیقت ہے۔ کہ ایک عالم
ذات اُن سے دُور رہ کر یعنی عناصر اور حواس خمسہ کے کرشمہ جات کے دایرہ سے نکل کر
احاطہ دایرہ عقل میں رہ کر ہی ہستی بحت پانے کا عامل ہوتا ہے جس کا مقصد اولین لا
انتہا خوشی حاصل کرنا ہے اور اس منزل پر پہنچ جانے کے لئے جس شاہراہ پر وہ مصمم
ارادہ سے گامزن ہے۔ وہ ایک خود آگہی کی شاہراہ ہے۔ اس شاہراہ کو چھوڑنا پڑتا
ہے یا اس پر ٹھہرنا پڑتا ہے اور قدم آگے جانے سے روکنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ کشف و
کرامات کی دلچسپیوں میں اپنے ذہن کو لگا رکھیگا۔ ایسے شخص سے کشف و کرامات
اُسی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جس صورت میں اسکو حصول مقصد منتہے اکی کوشش
میں ایسے کرشمہ جات مجبور منشاء نظام کلی کے تحت کرنے پڑیں۔ جو انسان کسی شخص کے

کشف وکرامات پر فدا ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو ایک ذریعہ بنا کر اپنے سے بڑی چیز کی اظہار بڑائی کے لئے استعمال ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ ایسے انسان پابند قدرت ہیں۔ قادر نہیں ہو سکتے ہیں۔ جسقدر لوگ کشف وکرامات سے متاثر ہونگے اسی قدر وہ کشف وکرامات کرنے والے کی بڑائی کا اظہار ہوگا۔ جو اس کی خواہش رہی ہے۔ جہاں خواہش کا عنصر آجاتا ہے وہاں پر پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے۔ ان خیالات کی ترجمانی اُس انسان سے بخوبی ہو سکتی ہے جس کے ذہن میں اس بات کا شدت سے احساس اور یقین ہے کہ ؎

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں ہیں
دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں ہیں "اقبال"

چونکہ ہر انسان میں ایک ذرہ قوت ہے جو اسکو لاانتہا قوت ہستی سے حاصل ہوا ہے۔ بلکہ اُس کا ایک جزو ہے۔ اسی جزو نے اپنے کل میں جانے کے لئے جسم انسان میں پیدائش اختیار کی ہے۔ جس ذریعہ سے وہ اپنی ہستی کو کل میں عدم کر سکتا ہے اور جس کی خواہش ازل سے ہی لاشعوری طور اسکی سرشت میں آچکی ہے۔ اور اس خواہش ابدی ہستی کو پورا کرنے کے لئے ہی زندگی کے ہر فعل وعمل کا مختلف طریقوں سے مظاہرہ ہوتا ہے۔ ؎

تسلی داد ہر یک را بہ رنگے ز آتش نیست خالی ہیچ سنگے
ہماں آتش کہ لیلےٰ را جگر سوخت بہ مجنوں سر بصحرا دادن آموخت

جو اُس قوت لاانتہا کو شعوری یا لاشعوری طور حاصل کرنے کے لئے در پے ہے۔

صدق طلب

ہو حُسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا

ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھو

صِدق

اس قوت لاانتہا کے حاصل کرنے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے اور اس کے حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ جسقدر علم و عمل اس دنیا میں ہو کر چلا آیا ہے یا ہوتا چلا آئیگا۔ تمام انفرادیت موجودات کے اپنے اپنے کردار و فصل سے ہی ہو کر چلا آیا ہے یا چلا آئیگا۔ وہ غفلت میں پیدا نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی غفلت میں ان چیزوں کا فنا ہونا پایا جاتا ہے۔ ایک نظام کلی کے پابند یہ تمام کاروبار ہوش و حواس قایم رہ کر ہی پایہ تکمیل تک پہنچ رہا ہے۔ اس میں ہر ایک جسم جو پیدا ہوا ہے اپنے اپنے احاطہ قدرت میں زندہ رہ کر ہی اپنا اپنا فرض انجام دیتا ہے اور اس طرح دنیا میں آتا رہیگا۔ اس میں کوئی چیز اپنے فرض منصبی سے بیگانہ رہ کر کام نہیں کر سکتا ہے۔ خدا یا لاانتہا طاقت والا بھی اگر تھوڑی سی غفلت سے کچھ کام کرے تو یہ نظام نہیں رہ سکتا ہے۔ گویا یہ نظام کائنیات رواں دواں ہے اور زندہ ہے مردہ نہیں ہے۔ "خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے"۔ اور نہ ہی عناصر اپنے اپنے صفات ترک کر کے اس نظام کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ ہم یہ تصور میں حقیقی طور پر نہیں لا سکتے ہیں کہ بنانے والے نے یہ ساری کائینات بنا کر آنکھ موند لی ہے اور نظام خود بخود اسکی عالم بے خبری میں چل رہا ہے۔ جس قدر علم و دانش دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اور وہ اُن اشخاص نے جنکی بدولت ان کا اظہار ہوا ہے۔ اپنے ہوش و حواس قایم رکھ کر ظاہر کئے ہیں۔ اسلئے اس تمام علم و دانش کا اظہار۔ آنکھ بند کر کے یا عالم خواب یا عالم بے خبری میں جانے سے نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ جملہ حقیقت حال عالم بے داری میں ظاہر

ہوئے ہیں۔ اسلئے انسان کو لب بہ بند و گوش بند و چشم بند کرنے سے کوئی چیز حقیقت حال میں سمجھائی نہیں جا سکتی ہے۔ اس میں کسی مزاولت یکسوئی قلب۔ یوگ پر پنچے اور پاؤں اوپر کرنے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ ان تمام چیزوں کا استعمال صرف کشف و کرامات کے اظہار کے لئے حصول قوت کی ضرورت رہی ہے۔ جس سے ایک غیر معمولی قابلیت پیدا ہوتی ہے جو کہ تغیرات کی زد میں رہا ہے۔ بلکہ ان کے انجام دینے سے اصل حصول مقصد لا انتہا خوشی و لا انتہا طاقت میں کوئی مخصوص مفاد حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ اصل مقصد زندگی حاصل کرنے کے لئے ان اعمال کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ انسان اپنے ہوش و حواس میں قایم رہ کر ہی جو اس کو عالم بیداری میں حاصل ہیں حقیقت کا انکشاف حاصل کر سکتا ہے۔ ایک ہوشیار آدمی اپنا فرض اور جسم انسانی کے تمام لوازمات لے کر کاروبار زندگی ادا کرتے کرتے اس انتہا طاقت والی ذات کے ساتھ اپنی خود آگہی کو وابستہ کر سکتا ہے۔ جس میں شہود و غیب کا امتیاز نہیں رہتا ہے ہمارا خدا بھی جملہ عملیات اور جسمانی ورزش کر کے اس جہاں کا خالق نہیں بنا ہے وہ ہوشیاروں کا سب سے بڑا ہوشیار ہے۔ جس نے کوئی شے بطریق غیر معمول پیدا نہیں کی ہے جو کہ ہم عام مشاہدہ سے واضح طور پاتے ہیں۔ چونکہ ہر شے میں پیدا ہونے کے لئے ایک مخصوص عمل ہوتا رہتا ہے جس میں کسی غیر معمولی طریقہ کا ہونا پایا نہیں جاتا ہے۔ وہ طریقہ معمول کیا ہے۔ ایک مثال سے اسکی وضاحت ہو سکتی ہے۔ دنیا میں مجموعی طور پر ایک عام طریقہ ہے کہ آدمی جب سوتا ہے تو عموماً بستر پر یا زمین پر ہی لمبی تان کر سو جاتا ہے اور اسکے پاؤں کے تلوے زمین یا بستر پر نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف کوئی اور انسان کسی وقت جب سونا چاہتا ہے تو وہ ایک غیر معمولی طریقہ

اختیار کرتا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے یا کرسی پر یا کھڑے ہی نیند میں جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلئے عام انسان کو حقیقت حال حاصل کرنے کے لئے غیر معمولی چیزوں کی امداد حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری زندگی ہوش وحواس قایم رکھکر ہی بہ طریق معمول خوشی کی تلاش میں ہے اور ایسا ہو کر ہی ہم اُس قوت لاانتہا کے ساتھ ایک ذہنی وابستگی حاصل کرسکتے ہیں۔ جس کے لئے کچھ عجیب وغریب افعال واعمال غیر معمولی طور عمل میں لائے جانے ضروری نہیں ہیں۔

دور حاضرہ میں کئی دانشوروں میں چند ایک جنکو روحانی شخصیتوں میں شمار کیا جاتا ہے اور جن کے معتقدوں میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگ ہیں اُن کے تعمیل ارشادات میں انسان کو اپنے لباس و پوشش سے بے نیاز ہونے کی ہدایت ہوتی ہے۔ نشہ آور اشیاء استعمال میں لائے جانے اور دیسی ورزش کے کرتب کی مہارت حاصل کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔ جو اُن کی نظروں میں طریقہ روحانیت میں خدا کے پہچانے جانے اور ایک غیر معمولی طاقت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور لوگ اُن کو مخلوق سے بالاتر (Super man) تسلیم کرتے ہیں چونکہ اُن سے چند کرامات و کرشمہ جات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ جو ایک ذریعہ ہے جس سے عام لوگ متاثر ہو کر اُن کے لاشعوری خواہشات حاصل کرنے کے آلہ کار بنتے ہیں۔ اور اس طریقے سے عام لوگوں کو روحانیت کا سبق دے رہے ہیں۔ مگر یہ سب طریقے جب تک نہ انسان کو بہ ہوش وحواس قائم اصل مقصد زندگی کی طرف لے جائیں سبھی بازیچہ اطفال ہیں۔ جو اُن کے روحانی شخصیتوں اور اُن کے ارشادات پر عمل کرنے والوں کے لئے صرف دل بہلاوے کے سامان سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتے ہیں۔ چونکہ اُن کی روح میں مدارج ترقی حاصل

حاصل کرنے کے دوران اُن کی مخفی مگر زبردست خواہشات کو منظر شہود پر لانے کے لئے اِس قسم کے سامان پہلے ہی قدرتی طور پر موجود ہوتے ہیں۔

پہلے اِس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ جس چیز کو تمام مذاہب کے اوتاروں، پیغمبروں اور روحانی شخصیتوں نے جنہوں نے اللہ اور بھگوان کے حاصل کرنے کی تلقین کی ہے یا سائنس دان اس اصلی حقیقت و بنیادی زندگی کے تجسس میں ہیں کہ وہ کہاں ہے۔ تمام مذاہب نے اللہ اور بھگوان کے لئے ہزاروں قسم کی صفات اور ہزاروں قسم کے نام اور طرح طرح کے دماغی اختراعات و ایجادات منسوب کئے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ جملہ تفصیلات ہم کہاں رکھتے ہیں۔ اور اللہ اور بھگوان کہاں ہے۔ اس کے لئے کوئی خاص جگہ موجودات عالم میں یا اس سے پرے کہیں ہے جو ہماری دماغ سوزی۔ افعال و اعمال میں کس جگہ پر رہ کر ہی کام کرتے ہیں سو وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔ جب اس جگہ کی نشان دہی ہو گی پھر پہلے اس جگہ کا استعمال کیا جائے تو پھر یہ تمام منسوبات لاگو ہو سکتے ہیں پہلے پہل ان تمام چیزوں کے لئے اللہ۔ بھگوان کو ایک اصلی جگہ پر تو بٹھانا ہے تاکہ وہ اِدھر اُدھر نہ ہو جائے پھر جس طرح ہو چاہیے اُس پر صفات کی بارش اور پھولوں اور عبادتوں کی ورشا اور دفترِ عشق و عرفان کے سمندروں کے سمندر اُس پر بہا دئے جائیں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ کیونکہ ایک مخصوص جگہ کی نشان دہی ہو سکتی ہے۔ جو ذہن انسان کو لاکھوں کروڑوں نشانات میں دربدر ہونے سے بچائے۔ یہ وہ جگہ ہونی چاہیئے جو مذکورہ چیزوں سے بہت بڑی ہونی لازمی ہے۔ جس میں ایک تو مذکورہ اشیاء سما سکیں اور پھر بھی بڑی ہو۔ وہ جگہ صرف ایک ہونا ہستی مطلق ہے۔ جو سب سے بڑی چیز ہے جس میں ہمارا اللہ و بھگوان بھی سما سکتا ہے۔ چونکہ اس ہونے میں کمی و بیشی کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔ یہ ایک

مستقل جگہ ہے جس جگہ سے کوئی چیز بھاگ نہیں سکتی ہے اور اللہ و بھگوان کو سمجھنے کے لئے جو دربدری ہوتی ہے وہ ختم ہو گی۔ یہ جگہ انسان کے "انا" میں ہے۔ گویا اگر انسان کے "انا" میں قابلیت نہ ہوتی تو خدا و بھگوان اور ہستی کا تصور بھی نہ آسکتا اور جتنے اوصاف خدا اور بھگوان کی ذات کے ساتھ ہیں۔ اُن کا ظرف جسم انسانی کا جو "انا" میں اسکی خود آگہی کا نتیجہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کے "انا" میں وہ ساری باتیں موجود ہیں جو ہم حواس خمسہ سے اپنے جسم کے باہر مشاہدہ کر رہے ہیں۔ انسان اپنے "انا" کا ہی مشاہدہ کرے اور اسکا علم خود آگہی حاصل کرے تو تمام کائینات کا راز حاصل کر سکتا ہے۔ اور وہ تب ہی ممکن ہے جب انسان کا شعور "انا" کی اس قابلیت کے ساتھ ساتھ وابستہ ہو اور جسقدر جسم سے باہر کی اشیاء ہیں ان کے ساتھ اس قدر لگاؤ ہو جس قدر عام لوگوں کو خود آگہی کی طرف ہے۔ جو عموماً کم ہے۔ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق "اقبال"

یہی وہ "انا" کا احساس ہے جو انسان کے ساتھ ہے اور جس کی بدولت انسان اشرف المخلوقات کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ کسی مزاولت یا مخصوص عمل سے نہیں بلکہ اپنی زندگی کے روزمرہ معمول کام سے جو انسان کرتا ہے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر یوگ وغیرہ جملہ انسانوں پر کسی حاکم جبار کے حکم کے تحت لاگو کر دینگے تو یہ تمام کاروبار زندگی و جہان چل نہیں سکتا ہے جب کہ ہر ایک فرد بشر عملیات یکسوئی قلب۔ حبس نفس و ورد اسم اعظم کرتے رہینگے تو نظام کلی میں فرق آئیگا اور وہ مقصد ہستی فوت ہو جائیگا۔ جس مقصد کے لئے اس جہان کو وجود میں لایا گیا ہے اور غرض و غایت نظام کلی میں ایک

تضاد پیدا ہوگا جو بطریق معمول حل نہیں ہو سکتا ہے۔ ہماری زندگی کا ہر لحظہ اس "ہونے" کو دہراتا ہے۔ انسان کو اپنا ذہن صرف اس ایک چیز کی طرف لانا ہے جو اسکو ایام زندگی کے روزانہ پروگرام میں کوئی خلل نہ ڈالے۔ ہونا ہی وہ چیز ہے جو نہ کبھی پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی اسکا فنا ہونا ہے۔ بس یہی ایک چیز تصور میں رکھکر ہماری منزل کا پتہ لگ گیا ہے اور اس منزل کو حاصل کرنے کے لئے ہماری زندگی جو گوناگوں افعال و اعمال کا مجموعہ ہے پہلے ہی اس میں موجود ہے اور کسی خاص چیز کی ضرورت نہیں ہے جس سے کہ اس احساس ہستی کو حاصل کیا جائے۔ آئے دن فرائض انسان ہونے کی انجام دہی حسب جگہ و وقت اس ابدی شئے کا ذہن میں رکھنا ہی کافی ہے۔ سہ۔

انجام دے جو اپنے فرائض کو ہم نشین
جو ذرہ جس جگہ ہے وہی آفتاب ہے

یہی ایک علم ہے اور یہی ایک عمل ہے کہ ہونا ہی سب موجودات کی اصلیت ہے جو کبھی نہ مرتا ہے اور نہ ہی پیدا ہوا ہے بلکہ امر ہے اور جگہ و وقت کی قید سے آزاد ہے۔ ہماری زندگی اس کو کلی طور حاصل کرنے کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ اس کے لئے جسم کو مخصوص افعال و اعمال سے نہ تو گرمانا ہے اور نہ ہی ٹھنڈا کرنا ہے اور نہ ہی کسی غیر معمولی حرکات و سکنات کا استعمال کرنا ہے۔ بلکہ شہود و غیب کا کوئی امتیاز نہیں رکھنا ہے۔ چونکہ "ہونا" ہر جگہ و ہر فکر و عمل میں موت و پیدائش میں ہستی لازوال کی حقیقت میں موجود ہے جس کے لئے کسی غیب کی پردہ دری کی مزاولت کرنے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ ہمارے "انا" میں سب چیز موجود ہے یہی اسکے حاصل کرنے کا طریقہ ہے جو انسان اس طریقہ پر کاربند رہیگا۔ اور اپنے حالات زندگی کو تصور میں رکھ کر اپنے ذاتی ذہن سے بخوبی

تجزیہ کر کے تجربہ کریگا اور اپنے وقت پر یعنی ؎

چاک مت کر جیب بے ایام گل

کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے "غالبؔ"

کے مصداق لاانتہا خوشی و قوت جو اس ہونے میں ہے جسکا مجسمہ ہمارا " انا " ہے حاصل کریگا۔

لاانتہا خوشی کو حاصل کرنے میں وقت اور وسعت کی پابندی نہیں ہے نظام قدرت میں غلطی نہیں ہے۔ اپنے وقت پر اپنی اپنی مخصوص حالت تحصیل مدارج علم کے ساتھ ساتھ یہ عقدہ کھل جائیگا۔ مگر اس میں ضروری ہے کہ ؎

فطرت کے تقاضوں پر نہ کر راہ عمل بند

مقصود ہے کچھ اور تسلیم و رضا کا "اقبالؔ"

انسان کو ایک چیز ذہن میں مسلمہ طور پر قبول کرنی ہے کہ یہ کرشمہ جو ہم جسم کے اندر اور باہر دیکھتے ہیں اور تجربہ میں لاتے ہیں کیوں ہے اور اس تمام شعبدہ بازی میں ایک جزو مشترکہ کون سی چیز ہے اور وہ چیز ذہن میں لائے کہ وہ اپنے " انا " کی خود آگہی ہے جو موت و حیات سے آزاد ہے۔ یہی " ہونا " ایک آلہ ہے۔ ایک ذریعہ ہے باریک ترین اور لطیف ترین۔ بنیادی نقطہ ہے اُس اتھاہ طاقت و خوشی کا جس کا اظہار تمام موجودات کائینات ہے اور اسی تمام موجودات کے ہونے کی غرض و غایت کیا ہے جو صرف ایک لاانتہا مسرت ہے جس کے ہونے کے ساتھ طاقت ہستی ہے جو زندہ ہے اور انسان کو اپنی انفرادی ہونے کو " انا " کو اس اتھاہ طاقت خود آگہی کے روبرو ہو کر اُس میں مدغم ہونا ہے۔

عُلما و فُضلا اور مردانِ مرتاض روحانیت نے اپنے اپنے کلام میں ایسے فقرہ جات و مقولہ جات وغیرہ کا اظہار کیا ہے جو قدیم الایام سے بطور ضرب المثل انسان نے مشعل راہ تسلیم کر کے استعمال میں لائے ہیں۔ اُن کے کلام سے ایسے نتایج اخذ ہوئے ہیں جو حقیقی اور ناقابل تردید ہیں وہ نتایج اُنھوں نے کہاں سے لائے جنکا اُنھوں نے اپنے اپنے کلام میں اظہار کیا ہے۔ وہ انھوں نے بہ ہوش و حواس قایم اپنی زندگی کے عالم بیداری کے گوناگوں حالات و واقعات جن پر عام زندگی کے حالات حاوی ہیں اخذ کئے ہیں۔ جو اُنکو تجسس حقیقت عالم میں حاصل ہوئے ہیں۔ چونکہ اُن کی روح قالب عنصری کے تمام لوازمات و صفات و افعال و اعمال سے متاثر ہو کر ہی اِن کے کلام میں صادر ہوئے ہیں۔ اس طرح اگر عام انسان بھی اپنے جسم کو اور اسکے حرکات و سکنات اور عام فہم کا استعمال۔ حقیقت پر پہنچ جانے کیلئے کرے تو ایک معمولی ذہنیت کا آدمی بھی خود بخود حقیقت کی طرف راغب ہو کر اُن برگزیدہ شخصیتوں کے ارشادات کے اصلی معنی و تجربہ سے آگاہ ہوگا۔ چونکہ ہر انسان کو اپنی ایک انفرادی حیثیت ذہنی ہے جو اپنی نوعیت کی ہے اور حقیقت اپنے مخصوص ذہنی طاقت سے حاصل کر سکتا ہے۔

اس حقیقت کے مقام پر پہنچ جانے کے لئے سب سے پہلے اِس موضوع کے لئے ایک دلچسپی پیدا کی جانی ضروری ہے۔ جب تک نہ کسی خاص مضمون کے لئے انسان اپنا ذاتی رجحان پیدا کریگا۔ اُس مضمون کے رموز و کنایات سے وہ واقف نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ اِس سے لُطف اندوز ہو سکتا ہے۔ تمام آدمیوں میں سے بہت کم تعداد ہے جو پکے گانے کو پسند کرتے ہیں۔ اگر پکے گانے کی نزاکت احساس

ہم آہنگی و مٹھاس اور سُریلے پن کا مزہ عام سننے والوں میں پیدا کیا جائے گا تو اس قسم کے گانوں کے ساتھ بہت آدمیوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس طرح ایک باکمال آرٹسٹ کے آرٹ کو تجزیہ سے اسکی خوبی نہ بتلائی جائے تو ایک عام آدمی کو بہترین تصویر کے لئے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جب تک نہ اس تصویر کی نزاکت خیال و احساسات کی طرف جو آرٹسٹ نے اس میں بھر دئے ہیں عام آدمی کی بھی توجہ دلائی جائے۔ اس طرح ہر ایک علم وفن کے لئے ہے۔ کہ انسان اپنا ذاتی شوق پیدا کرے۔ عام طور پر احساسات اور کسی چیز کی جاذبیت پہلے دل سے ہوتی ہے جس میں عقل کا عنصر دوسرے درجہ پر آتا ہے۔ عقل کے ساتھ جب احساسات شامل کئے جائیں تو حقیقت سمجھنے کے لئے ایک پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ اسلئے باریک سے باریک ترین چیز کے لئے صرف عقل ہی سے تجزیہ کیا جائے تو جو نتیجہ اخذ ہوگا وہ حقیقت کے قریب ترین ہوگا۔ اسلئے حقیقت حاصل کرنے کے لئے جس چیز کے لئے حواس خمسہ استعمال کئے جائیں۔ اُن کی اصلی حقیقت کا انکشاف پورا نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک نہ عقل کی طاقت اس میں استعمال میں لائی جائیگی۔ اس وجہ سے عام طور پر مضمون زیر بحث کے لئے عموماً عام آدمی کو دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ تر ناول۔ ڈرامہ۔ پُر اسرار واقعات وافسانے اور جاسوسی کہانیاں وغیرہ جن میں احساسات زیادہ اور عقل کی باریکی استعمال میں لائی جاتی کم ہے لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ جن مضامین میں زیادہ سے زیادہ دماغ کی نزاکت عمل کی ضرورت ہے وہ عام احساسات کی دلچسپی کے دائرہ سے باہر ہیں۔ ایک فن اور آرٹ کو سمجھنے کے لئے بھی دماغی قابلیت کی ضرورت ہے مگر جہاں علم اور اسکے نتائج اخذ کئے جانے مطلوب ہیں وہاں صرف عقل ہی کام کرتی ہے

اسلئے باریک مضامین جو کہ فن میں شامل نہیں ہیں۔ اُن میں علم کی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ علم میں طاقت ہے۔ اس لئے اس کے حاصل کرنے میں ایک جذبۂ شوق آگہی ہونا لازمی ہے چونکہ کسی چیز کی حقیقت حاصل کرنے کے لئے احساسات کو شامل کرنے کی اُتنی ضرورت نہیں ہے جتنی علم و عقل کی ہے۔ اسلئے مخصوص ذاتی تڑپ کا ہونا نہایت ضروری ہے علم میں چونکہ طاقت ہے اور طاقت کے ساتھ خوشی ہے جو کہ انسان کا شعوری یا لاشعوری طور نصب العین ہے اور وہ خوشی جسکی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس علم و عقل حاصل کرنے کے لئے ایک ابتدائی شرط ہے اور وہ ہے بقول علامہ اقبال۔ ؎

علم و حکمت زاید از نانِ حلال
عشق و رقت آید از نانِ حلال

اس لئے اس کتاب کے مضمون کے پڑھنے والے کو ایک بوالہوس اختیار کرنی لازمی ہے اور اغلب ہے کہ رفتہ رفتہ اس مضمون کے لئے وہ ایک تعشق پیدا کریگا۔ جس میں کسی راہ نمائی کی ضرورت نہیں ہے چونکہ اسکی سرشت میں خود آگہی موجود ہے جو کسی خاص شخص کا ورثہ نہیں ہے اور وہ اپنے شوق سے اس راستہ پر گامزن ہو کر اپنے لئے وہ خود راہ نمائی کر سکتا ہے جسکا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے اور اس مقام پر پہنچ جائیگا جہاں وہ اس بات کا شدت سے احساس کریگا کہ ؎

راہ نما کی راہ نمائی تو ٹھیک کر رہ گئی
شوق صادق ہی نے پہنچایا سرِ منزل مجھے

"جوش ملیسانی"

پیشِ لفظ

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتا نہیں دانا!
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گُہر سے
اقبالؒ

اِن صفحات کے مطالعہ سے ممکن ہے کہ پڑھنے والے کو کئی خیالات کے ساتھ اتفاق ہو یا کئی خیالات کے ساتھ اتفاق نہ ہو یا اپنے ذہن کے مطابق ان خیالات کی ترتیب و ادا میں کچھ تفاوت پائے۔ چونکہ کوئی بھی چیز ہر انسان کے ذہنی معیار کے ساتھ یکساں مطابقت نہیں رکھ سکتی ہے۔ اس میں تضاد و اتفاق کا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ ہر انسان کا ایک مخصوص ذاتی ذہن ہوتا ہے جو دیگر انسانوں سے اِسکو ایک انفرادی حیثیت دیتا ہے۔ وقت میں ٹھہراؤ نہیں ایک مسلسل روانی ہے ایک لمحہ کی گردش میں اور دوسرے لمحہ کی گردش میں اپنی اپنی ایک باریک انفرادیت ہے۔ اس وجہ سے دو انسان ایک ذہن کے مالک نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہی تقاضائے فطرت ہے اور قانون قدرت ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اِن جملہ خیالات میں، ایک پڑھنے والے کو اِن خیالات کے ساتھ کسقدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ ہم آہنگی ابتداً ایک اور چیز پر قایم ہے اور وہ یہ ہے کہ اِن خیالات کو ایک ایک انسان نے زندہ ہو کر اپنے ہوش و حواس قایم رکھکر اظہار کیا ہے۔ یہی حال پڑھنے والے کے لئے بھی ضروری ہے۔ تب ہی ان دونوں میں ایک حقیقی رشتہ قایم ہونے کی جوازیت ہے

جس قدر علم و دانش ماضی میں آیا وہ تمام کا تمام مکمل نہیں ہے۔ چونکہ اس دنیا میں کوئی چیز انفرادی طور مکمل نہیں ہے۔ اگر مکمل ہوتی تو اسکا اظہار بعید از قیاس ہوتا۔ چونکہ کوئی چیز بہ یک وقت نہ پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی یہ یک وقت دوسری چیزوں کے ساتھ ختم ہوتی ہے وقت کے لحاظ سے اگر ایسا ہونا ممکن بھی ہو تو بھی جگہ ضرور مختلف ہوگی۔ اس میں تفاوت ضروری ہے۔ اسلئے ماضی کے علم و دانش زمانہ حال کے ادب سے تول لینا ہے۔ جو چیز حال کے معیار پر صحیح اترتی ہے۔ وہی قابل قبول و تقلید ہے۔ جو حال کے معیار پر پوری نہیں ہے اسکو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اسلئے وہی چیز درست ہے جو زمانہ حال کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔ البتہ زمانہ حال کی بنیاد ماضی پر قایم ہے۔ لیکن اسکا مطلب نہیں کہ جو دانہ ماضی میں بویا گیا ہے وہ اس وقت کا ماحول لے کر پیدا ہوگا۔ حال کا اپنا ماحول ہے اور ماضی کا اپنا اور زمانہ مستقبل کا ان دونوں سے مختلف ہے۔ اگرچہ ماحول میں کسی حد تک یکسانیت بھی پائی جاتی ہے وہ ذاتی ہوگی سطحی نہیں۔ ان تینوں زمانوں میں ایک چیز بدستور قایم ہے وہ یہی "ہونا" ہے۔ جس پر تغیرات زمانہ و ماحول اسکے "ہونے" پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے ہیں۔ زندگی حال میں ہے اس میں ماضی کی ٹھوس حقیقت اور حال کا ماحول بھی ہے۔ گویا مستقبل کا زمانہ ماضی و حال دونوں کے تاثرات سے ہی قایم ہے۔ اس میں ماضی اور حال کے تاثرات جڑے ہوئے ہیں۔ جو ایک مختلف حقیقت ہو کر مستقبل میں ظاہر ہونگے۔ اپنے اپنے زمانہ کے ساتھ ایک مخصوص ماحول ہوتا ہے۔ جو کسی دوسرے زمانے میں تمام حد تک قایم نہیں رہ سکتا ہے یہی ایک وجہ ہے کہ صدیوں سے تمام مذاہب میں کئی روایات و لوازمات کی پابندیاں لاگو ہو چکیں ہیں جو قابل تقلید و عمل بتلائی گئی ہیں۔ لیکن زمانہ حال میں وہ سو فیصدی قابل عمل نہیں ہیں۔ چونکہ ہر ایک چیز زیر تغیرات ہو کر وہ پوری طور قابل قبول نہیں ہے۔ جس قدر کہ

وہ لوازمات و روایات حاصل تھے جبکہ وہ جاری ہوئے تھے۔ اُن میں رفتار زمانہ کے ساتھ کافی حد تک تغیر و تبدل پیدا ہوا ہے جو موجودہ زمانہ کے حالات و حقیقتوں کے مطابق نہایت ضروری ہے۔ چونکہ تمام ارشادات سابق ابتدائی حالت جوازیت پر قایم نہیں رہ سکتے ہیں۔ اسلئے ان میں موجودہ صورت حالات کے مدنظر ترمیم و تصحیح کی ضرورت پائی جاتی ہے

نظر آتے نہیں بے پردہ حقایق اُن کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومیٔ تقلید سے کور اقبالؔ

ان تینوں زمانوں میں ایک بنیادی حقیقت ہے جس کے پردہ سیمین پر ہر ایک چیز کے گھٹنے اور بڑھنے یا تغیرات کی زد میں آنے کے حالات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان تغیرات میں ایک واضح حقیقت ہے کہ وہ کس چیز پر رہ کر ہی زیر تغیرات آتے رہتے ہیں۔ اور وہ چیز صرف ایک ہوتا ہے جو کہ جملہ تغیرات کی زد میں نہیں ہے جو ان تینوں زمانوں کے اثر و ماحول سے اپنی حیات ابدی کو محفوظ رکھکر ہمیشہ قایم ہے۔ اس ہستی کو ذہن میں قایم ہونا ہے اور یہی ایک بلا تغیر چیز ہے جو انسان کے ذہن میں لاشعوری طور موجود ہے۔ لیکن انسان دیگر اشیائے زیر تغیرات و تبدیلی پر ہی اپنی توجہ کو مبذول کر کے زندگی کی گوناگوں مصیبتوں میں مبتلا ہوتا رہتا ہے اور زیر تغیرات چیزوں پر ہی اپنی ساری زندگی وقف کرتا ہے۔ خود آگہی ایک چیز ہے جو انسان کو اپنے ذہن میں بہمہ وجوہ شعوری طور قایم رکھنا ہے۔ خود آگہی تمام "ہونے" کا علم ہے۔ اس چیز کا اکتساب کرنا ہے جو بنیادی ہے اور نہ ہی دیگر زیر تغیرات چیزوں کا۔ اس خود آگہی کی ایک عادت سی بنائی جاتی ہے۔ چونکہ اسکی مشق مکرر سے ذہن انسان میں ایک بلا تغیر پذیر چیز کی جو طاقت و قوت ہے پیدا ہو سکتی ہے جو انسان کو طاقت و مسرت لاانتہا کی طرف لے جاۓگی چونکہ جس چیز کی طرف زیادہ رغبت ہو گی اسکا اثر ذہن میں زیادہ ہو گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان ان

چیزوں سے دلی وابستگی رفتہ رفتہ چھوڑتا جائیگا جن کے لگاؤ سے دل انسان کو کئی مصیبتوں شکار ہونا پڑتا ہے اور انسان کو اپنے حقیقی فرض اور تلاش لاانتہا خوشی سے محروم ہونا پڑتا ہے اس طرح ہمارا مستقبل ایک جدید حقیقت لے کر ہو گا جو ماضی اور حال کے تغیرات کی زد میں نہیں ہو گا یعنی تشے لامحدود ہستی بجت کے صفات لے کر لاانتہا خوشی ولاانتہا طاقت کے حاصل کرنے کی خواہش لے کر ہو گا۔ اور جن چیزوں کے ہونے سے یا اُن کے تاثرات سے زندگی رنج و غم میں مبتلا ہوتی ہے۔ ہماری خود آگہی کی ارتقاء حاصل کرنے میں کوئی تباہ کن اثرات نہیں ڈال سکتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو اپنے جسم کی کوتاہیوں میں پابند ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے "انا" میں اور جسم میں ایک مفروضہ لگاؤ پایا جاتا ہے۔ جس کے اثر سے "انا" جیسی بڑی اور لاانتہا طاقت رکھنے والی چیز بھی جسم انسانی میں مقید ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "انا" میں پابندی آچکی ہے دراصل انسان کا "انا" اور جسم دو چیزیں ہیں جبو قت جسم ختم ہو گا اور جس کا ہونا ضروری ہے۔ اُس کے "انا" "میں" کی حقیقت واضح ہو گی اور یہ تب ہی ممکن ہے جب انسان اپنے ذہن کو زندگی میں کسی وقت بھی اس حقیقت کو ذہن نشین کرے کہ جسم انسان سے بڑی چیز ایک "انا" ہی ہے اور وہ ایک نقطہ ہے اس کائینات کے محیط پر جس میں محیط اور مرکز میں کوئی فرق نہیں ہے اس طرح جسم کے کرشمہ جات سے ایک بے لگاؤ پن حاصل کیا ہو۔ اور وہی انسان خود آگہی کی منزل ارتقا پر اصل مقصد لاانتہا خوشی و لاانتہا طاقت کا مستحق ہو گا۔

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے تو دی کی نگاہ کا مقصود (اقبال)

ہماری زندگی میں یومیہ دو کے ساتھ روز مرہ کا لگاؤ ہے۔ اس کو ذہن میں رکھکر مثال کے

طور پر کسی حد تک حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ برقی رو کہاں سے پیدا ہوتی ہے جو ہمارے کمرے میں بھی ہے اور جس طرح سے ہم اس سے کئی طرح کے کام لیتے ہیں۔ ہمیں اسکا بھی علم ہے۔ کہ یہ ایک بجلی گھر سے پیدا ہوئی ہے جو کسی جگہ موجود ہے اور یہ بھی علم ہے کہ اگر اس بجلی گھر سے تار نہ نکلتے تو ہمارے کمرے میں بجلی کی روشنی نہ ہوتی۔ یہ تار برقی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر یہ ذریعہ نہیں ہوتا تو ہمیں بجلی کے ہونے کا علم بھی نہ ہوتا اور نہ ہی اسکا فائدہ ہم اپنے کمرے میں اٹھا سکتے۔ بجلی گھر جہاں سے بجلی پیدا ہوتی ہے اگر برقی رو کو باہر لے جانے کے لئے تاروں کا استعمال نہ ہوتا تو اس بجلی کے تمام کرشمہ جات بھی نہ ہوتے۔ اس بجلی گھر سے تین ہائی ٹینشن تار بہ طریق معمول نکلتے ہیں۔ جن سے بجلی گھر کی بجلی باہر لے جانے کے لئے استعمال میں لائی جاتی ہے۔ یہ کام ایک تار سے یا کئی اور تاروں سے بھی انجام دیا جا سکتا۔ لیکن وہ طریقہ غیر معمولی ہوتا۔ جس کا علم بخوبی ماہران برقی رو انجینئر ان کو تکنیکی وجوہات کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ ان بنیادی تین تاروں سے بعد میں کئی تار نکلتے ہیں۔ کسی جگہ ایک بڑا کارخانہ چلتا ہے۔ ایک جگہ ایک وسیع عالیشان تعمیر میں یا ایک بڑی نمائش گاہ میں یا ایک بڑے ہسپتال میں بجلی اور دیگر جگہوں میں اس بجلی کا استعمال اور مظاہرہ ہوتا ہے۔ گویا لاانتہا طاقت کے مظاہرے کے لئے موجودات معرض وجود میں آئے اور اسکے تمام کرشمہ جات اسی طاقت کے ذریعہ پیدا ہوئے ہیں۔ اگر بجلی کی طاقت ایک معمولی پانچ کنڈیل پاور والے بجلی لمپ میں یا بڑے بڑے کارخانہ جات میں نہیں ہوتی تو اسکا مظاہرہ بھی نہ ہوتا۔ بڑے بڑے کارخانے دیگر ضروری اسباب و آلات کے باوجود بجلی کے ہونے سے ہی قائم ہیں۔ بڑے بڑے خدا رسیدہ بزرگ۔ سادھو۔ فقیر۔ اولیا و انبیاء۔ رشی منی و دیگر برگزیدہ شخصیتیں جن سے عام لوگ مستفید ہوتے ہیں وہ اس اعلےٰ برقی رو کے نظام کے تحت کام کرتے ہیں اور

ایک بڑی طاقت سے ایسا کام کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں گویا تمام اُس لاانتہا کی طاقت کے اظہار کے ذرائع ہیں۔ دراصل یہ تمام کائینات اس ایک بڑے سے بڑے بجلی گھر کی بجلی سے معرض وجود میں آئی ہے۔ جس وقت اس بڑے بجلی گھر کو اصلی حالت میں دیکھنا ہوگا جس کا تصور حقیقی طور کسی کے سنانے سے یا کہنے سے ذہن میں نہیں آسکتا ہے۔ جب تک نہ خود دیکھنے والا اس کے روبرو جا کر دیکھ سکتا ہے۔ اسکے لئے رسل و رسائل ڈھونڈھنے ہیں۔ ایک راستہ اختیار کرنا جو راستہ بجلی گھر کی طرف سیدھا جاتا ہے۔ درمیان راہ مختلف لوگوں کے ساتھ ملنا ہے۔ مختلف آب وہوا و مقامات سے گزرنا ہے۔ اگر راستے پر چلتے چلتے بڑے بڑے کارخانوں۔ بڑے بڑے کرشمہ جات۔ برگزیدہ شخصیتوں۔ پیران۔ رشیوں اور منیوں کے کرشمہ جات پر ہی توجہ مرکوز کر کے اسی پر اکتفا کرینگے تو ممکن ہے کہ بڑے بجلی گھر تک پہنچنا محال ہے۔ بجلی گھر پر پہنچ جانے کے لئے ایکسوئی ارادہ کا ہونا ضروری ہے درمیان راہ کے ماحول میں رک جانے کو ترک کرنا ہے۔ نہ ہی رنج وغم و شادی یا جاذب نظر مقامات میں ٹھہرنا ہے۔ غرض کسی وجہ سے ہمارا قدم بجلی گھر تک پہنچنے کے لئے رُکنے نہیں چاہیں۔ اور نہ ہی ہماری نظر سے تین بڑے تار اوجھل ہونے چاہیں جو نشان راہبری منزل کرتے ہیں۔ یہ تین تار۔ ایک تو جسم ہے اور اسکا "انا" اور اور علم خود آگہی۔ چونکہ ان تین تاروں کے ذہن سے گم ہونے سے ہمارا ارادہ تجسس اور منزل مقصود بھول جائیگا اور نہ معلوم کتنے عرصہ راستے میں کشف و کرامات برقی رو میں مصروف ہو کر کب تک رہنا پڑیگا۔ جبتک نہ پھر اصلی تلاش کی طرف ذہن پھر سے راغب ہو جائے اور اس تجربہ کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ

کتنے کعبے ملے راستے میں کئی طور ملے ۔۔۔ ان مقامات سے ہم کو وہ بہت دور ملے

اس آخری منزل پر پہنچ جانے کے لئے زمانہ قدیم سے ابتدائی ذرائع استعمال میں لانے کیلئے تمام مذاہب میں تلقین کی جاتی رہی اور خاص کر یہ ذرائع زیادہ تر اوصاف نیک حاصل کرنے سے ملتے ہیں۔ جس میں راستی پاکیزگی۔ قناعت۔ رحم۔ شفاعت وغیرہ شامل ہیں اور ان کے حاصل کرنے کے واسطے مذہبی پابندیاں عاید کی گئی ہیں۔ تاکہ اصل مقصد لاانتہا خوشی و طاقت حاصل کرنے میں کوتاہی نہ آجائے۔ اور ان اوصاف نیک کو حاصل کرنا ہی بہت حد تک انسان کا نصب العین مذہب قرار دیا گیا ہے حالانکہ یہ نیک اوصاف صرف ذریعہ ہیں ایک مقصد منتہے حاصل کرنے کے لئے جو کہ صرف لاانتہا مسرت و قوت حاصل کرنا ہے۔ موجودہ دور میں موروثیت اور gene کا ہونا سائنس نے ثابت کیا ہے۔ اسلئے وہ تمام ہدایات جو کہ انسان کو نیک و بد میں تمیز کرنے کی عرصہ دراز سے اوتاروں اور برگزیدہ شخصیتوں نے انسان کو دی ہیں۔ نسلاً بعد نسل انسان کی سرشت میں مرکوز ہو چکے ہیں۔ اور شعوری یا غیر شعوری طور انسان کے خمیر میں سما چکی ہے۔ اس بارے میں انسان کو تلقین کرنے کی ضرورت نہیں ہے انسان کے دل میں ہر فعل کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے۔ اگرچہ اسکی ظاہری تعلیم ہوگی یا نہ۔ شائد ہی کوئی انسان موجودہ صدی میں ایسا ہوگا جس کے دل میں نیکی و بدی کے متعلق اپنے دل کے احساسات اور ذہنی معیار سے جانکاری نہ ہو۔ پھر بھی بدی ایک مجبوری ہے محدودیت کی۔ دنیا کے تمام علم و کتب و درس و تدریس اس بات پر متفق ہیں کہ اوصاف نیک و اخلاق حسنہ کیا ہیں اور اوصاف بد و اخلاق مذموم کیا ہیں اور ان میں کسطرح تمیز کر کے کس صفت کو اپنے کردار و فعل میں اختیار کرنا ہے اور کیوں گذشتہ صدیوں سے ان صفات پر زور دیا گیا ہے جس کے ترک و ایجاب کے لئے وقتاً وقتاً پر عظیم شخصیتوں نے

انسان کو اُن کی طرف توجہ دلائی ہے اور تمام مذاہب اس پر اپنے اپنے نصب العین اخلاق نیک و افعال بد پر متفق ہیں۔ مگر جہاں تک مقصد ہستی کے اظہار کا تعلق ہے۔ اِس میں مختلف مذاہب میں منتہائے مذہب کے عقاید میں مختلف مقاصد دئے ہیں۔ کسی مقام پر باپ اور کسی جگہ رسول کسی جگہ ذات کسی جگہ نور کو ترجیح دی ہے اور اللہ تعالےٰ اور پرم آتما بھگوان کو اِن سے ایک آخری مقام دیا ہے۔ اِن میں زیادہ تر انسان کا ذہن غیب پر اور وجہ اور اثر کے ترتیب سے بالاتر لگائے جانے کی کوشش کی گئی ہے اور زیادہ انحصار اعتماد پر ہی رکھا گیا ہے اور اسرار مخفی پر ہی بنیاد رکھی گئی۔ جو کہ بہت کم تعداد کے لئے قابل اظہار و تعلیم تسلیم کئے گئے ہیں۔ یعنی جو عام طور عقل سے پہچائے جانے نہیں جاتے ہیں۔ یعنی جہاں پر کلی طور اعتقاد پر ہی باور کیا گیا ہے۔ عنصر عقل سے زیادہ غیب پروری پر ہدایات و پابندیاں مذاہب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ چونکہ تقاضائے وقت کے حالات سے عام عقل انسانی میں وہ نزاکت نہیں آئی تھی جو کہ موجودہ دور میں بذریعہ سائینس و تزکیہ ذہن آئی ہے اور انسان کو ایک گونہ سکون و مسرت بخشتی ہے۔ یعنی الہام اور غیب و اعتقاد پر باور کرنا گذشتہ صدیوں میں ضرورت تھی جبکہ عام انسان میں ارتقائے عمل میں نزاکت تخیل و تجربہ نہیں آئے تھے جو آجکل حواس خمسہ کی امداد سے بھی تسلیم کئے جا سکتے ہیں۔ خوردبین کے ذریعہ ہم ایک پانی کے قطرے میں ایک ہجوم اجسام زندہ دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال گذشتہ صدیوں میں عقل تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔ گویا دور حاضرہ میں وہی حقیقت ہے جس پر حواس خمسہ کی اور آجکل کے ذہنی معیار کی مُہر ثبت ہو۔ وہ چیز جو صرف غیب اور اعتقاد پر ہی قایم ہے اور جس کو عقل کی کھٹائی سے تحلیل ہو کر پرکھا نہیں گیا ہے۔ اسکو قبول کرنے میں

شک کی گنجائش رہتی ہے۔ اسلئے جو حقیقتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں جب تک نہ وہ ہمارے روزمرہ زندگی کے واقعات سے تجربہ میں آئینگے اُن پر سو فیصدی یقین کرنے میں ایک آدمی کو تامل ہوتا ہے۔ اسوجہ سے جو نصب العین گذشتہ صدیوں سے برابر انسان کے ذہن میں رکھے گئے ہیں اس میں ہر قسم کے شکوک پیدا ہونے کی گنجائش ہے جب تک نہ وہ موجودہ دور کے علم و عقل سے اطمنان بخش ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اور بھگوان پر دہ یقین کلی رکھنے میں ہر انسان کے لئے یکسانیت کا درجہ نہیں ہے۔ جس طرح سے اُن چیزوں پر جو ٹھوس حقیقت سے اُنکے ذہن میں باعداد حواس خمسہ و معیار عام ذہن تجربہ میں آتے ہیں۔

اس تمام بحث کا مرکز خیال علم خود آگہی یا احساس ہستی "انا" ہے احساس ہستی کا مطلب خودی سے بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ غلط ہے در اصل لفظ خود آگہی کو خفیف کیا گیا ہے جو خودی معرض وجود میں آئی ہے جس طرح سے

کیا شاد کو خفیف کرے ہے زبان خلق
شاباش جس کو کہتے ہیں وہ شاد باش ہے "ذوق"

اسی طرح خود آگہی کو بھی خفیف کہا گیا ہے خودی کے ساتھ ایک گونہ رعونت شامل ہے جبکہ شمہ بھر بھی خود آگہی کے ساتھ نہیں ہے۔ اس خود آگہی کو ذہن نشین کرنے کے لئے جن خیالاتوں اور حقیقتوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ اُن تمام خیالاتوں اور حقیقتوں سے بڑھ چڑھ کر ایک "ہونے" کو مقدم رکھا گیا ہے چونکہ اس "ہونے" کو ہی تمام موجودات عالم میں ایک بڑی بڑی چیز قرار دیا گیا ہے جو کہ پیدائش و فنا کی صفات سے بالا تر ہے اور جملہ اشیائے موجودات کا منبع تسلیم کیا گیا ہے۔ ایسا تسلیم کرنے سے

یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ انسان اپنی ذہن سے اُن تمام حقایق اور اشیائے موجودہ کو خارج کرنے اور تب ہی وہ علم خود آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔ ایک ذرہ خاک سے وحدہ لاشریک کے درجہ تک موجودات عالم کو ذہن سے ترک نہیں کرنا ہے۔ چونکہ جو حقیقتیں ہیں وہ ماسوائے عالم بے خبری میں جانے کے انسان کسی وجہ سے اپنے شعور سے نیست و نابود نہیں کرسکتا ہے بلکہ جو عقایئد مذہبی و شرعی و اعتقادی ہونگے بدستور ایک خود آگاہ کے ذہن میں لاشعوری طور پر قایئم رہینگے چونکہ خود آگہی میں ترک و ایجاب کا عمل لاشعوری طور پر ساتھ ہے جسکا اشارہ علامہ اقبال نے اِس شعر سے واضح کیا ہے۔

خود آگاہی نے سیکھلادی ہے جس کو تن فراموشی
حرام آئی ہے اُس مردِ مجاہد پہ زرہ پوشی

علم خود آگاہی اِن تمام حقایق کا پس منظر ہے۔ ایک سہارا ہے ایک پردہ سیمین ہے جس کے بغیر کوئی شے معرض وجود میں نہیں آسکتی ہے اور نہ ہی اسکو مٹادینی والی کوئی شے ہے۔ اِس پردہ سیمین پر تمام اشیا جو ذہن میں موجود ہیں۔ جن میں اللہ اور بھگوان کے لئے ایک مستقل و ابدی جگہ اور بنیاد حاصل ہے۔ جبکہ ایک عام اِنسان کو علم نہیں کہ اُن کی اصلی جگہ کہاں ہے جہاں پر وہ اُسکی تلاش کرے۔ جس وقت انسان کے اِس علم خود آگہی میں وسعت و قوت آجایئگی تو اسکے اعمال و افعال و تخیلات و احساس اللہ و بھگوان میں ایک نیا معیار قایئم ہوگا جو اسکے دماغ میں پہلے نہیں تھا بلکہ موجودہ اور دور گذشتہ کے تمام ارشادات۔ احکام مذہبی و شرعی وغیرہ ایسے اعتقادات جن پر انسان کی سرشت قایئم ہوئی ہے ایک نیا رنگ۔ ایک جدید وسعت و حقیقت و مقصد زندگی جو انسان کو علم خود آگہی شعوری طور حاصل کرنے سے پہلے نہ تھا اسکی

روح کو اس طرح ترقی کی منزل پر پہنچا ئیگا جس کا اسکو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ حالانکہ ظاہری طور پر وہ کسی فعل زندگی سے بے بہرہ و بے لگاؤ دکھائی نہ دیگا۔ یہ ایک کرشمہ سے کم نہ ہوگا ایک انسان جو خود آگہی کی رفعتوں کو چھو جائیگا۔ عام فرائض انسانی بدستور ادا کرتا ہوگا۔ اور اس کے بنیادی عقاید متزلزل نہ ہو کر بھی ایک عجیب حقیقت کا انداز لے کر اسکے منظر شہود پر روشن ہونگے۔ اسکے خیالات و حرکات و سکنات میں ایک شان جوازیت خود آگہی آئیگا جو کہ اس نیرنگ کائینات کے قانون اور رفتار و تسلسل کے ہم آہنگ ہوگا جس کا مقصد منتہے ایک لا انتہا مسرت و شادمانی ولا انتہا قوت و قدرت ہے اور یہی مقصد اس کائینات کے وجود کا راز ہے۔ جو کہ انسان اپنے ہوش و حواس قایم رکھکر مفروضہ توہمات ذہنی و اعتقادی (بلا وجوہات عقل) چھوڑ کر اپنی روزمرہ زندگی کے مشاہدہ سے بطریق معمول پاسکتا ہے جس میں شہود و غیب کا کوئی امتیاز نہ ہوگا۔

خودی ہے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

(اقبال)